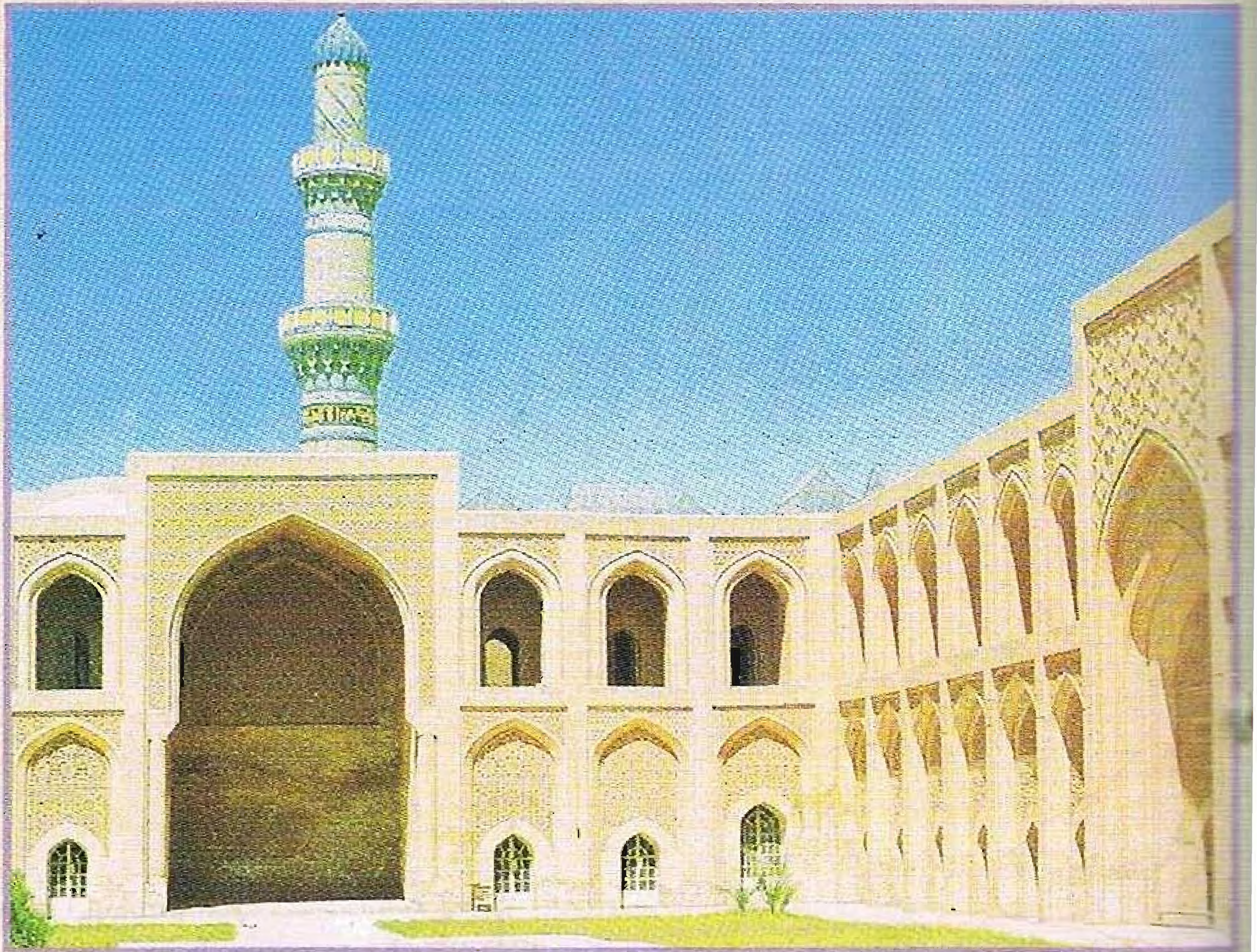
الرسالہ

Al-Risala

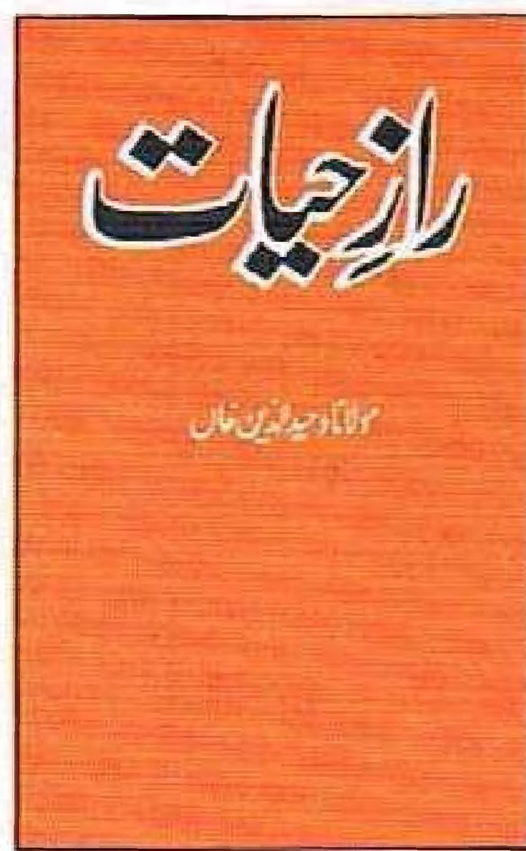
March 1997 • No. 244 • Rs. 8

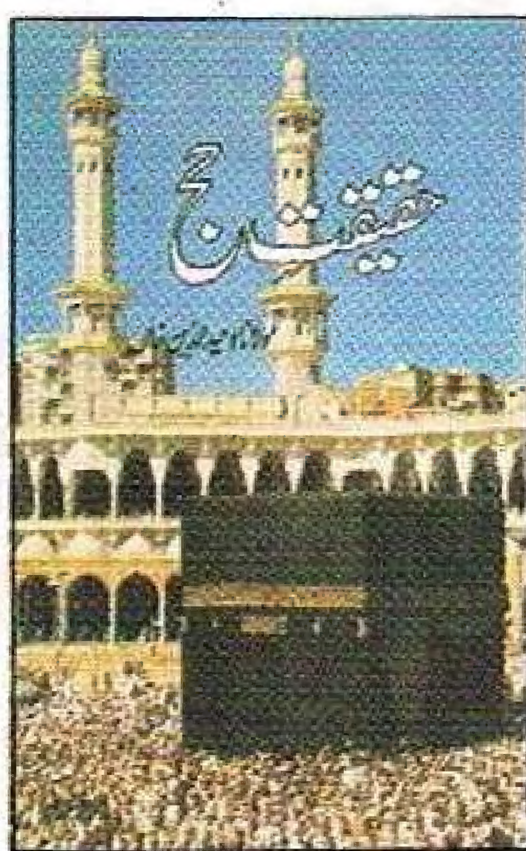
آخرت پسندی یہ ہے کہ آخرت کے سوا ہر چیز
آدمی کی نظر میں بے وقعت ہو جائے ۔

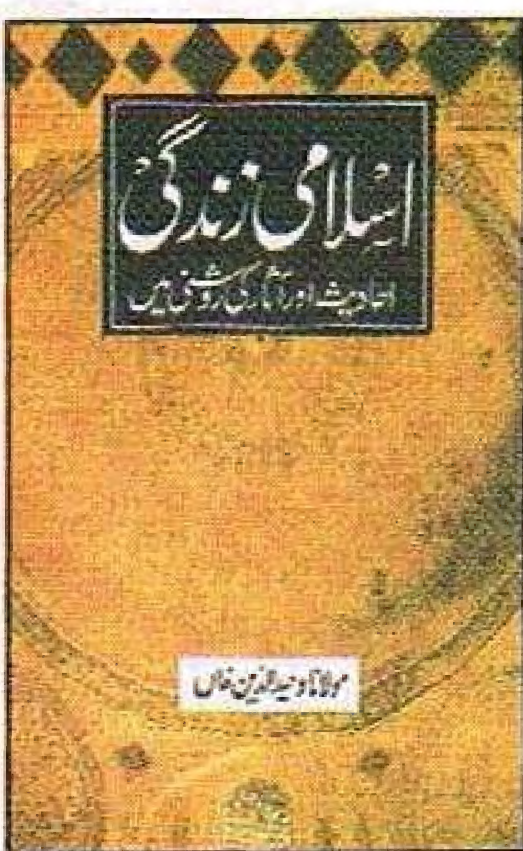


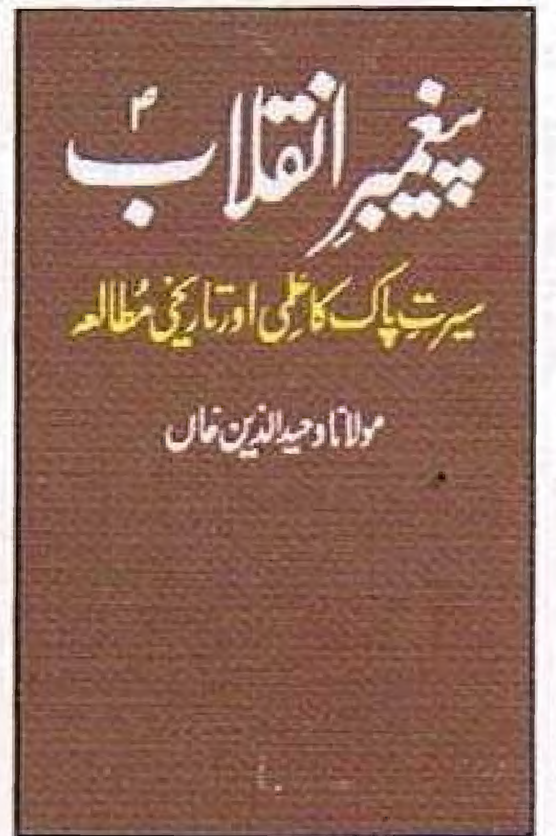
Mustansiriyyah, Baghdad

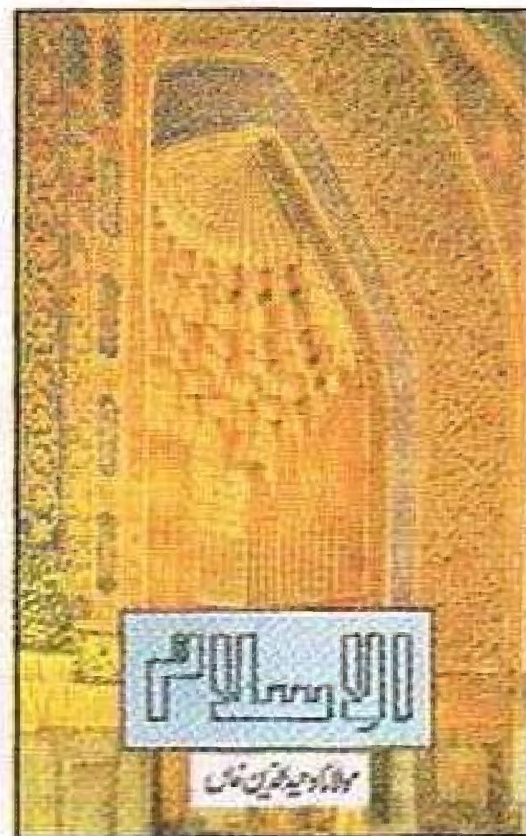

تجدید دین
مولانا وحید الدین خاں

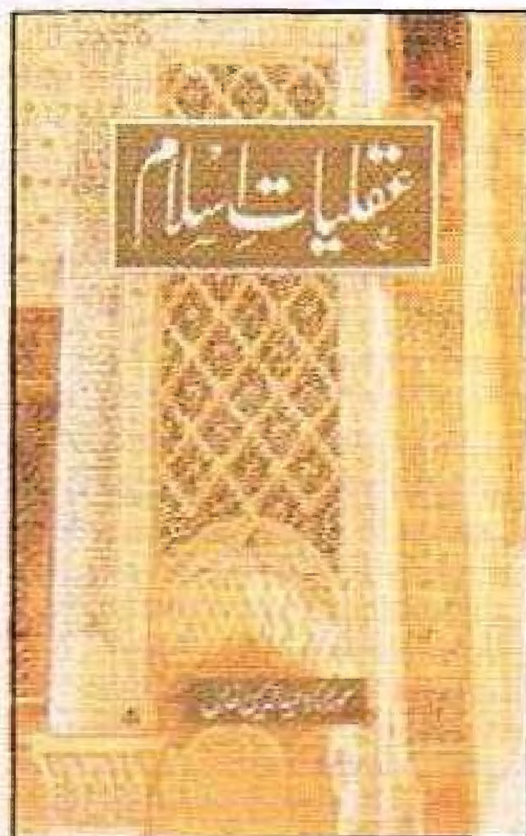

رازِ حیات
مولانا وحید الدین خاں

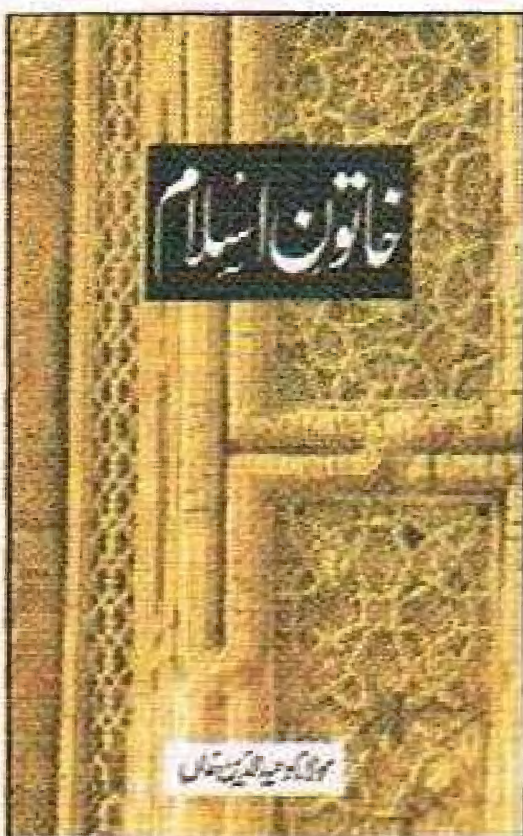

حقیقت حج
مولانا وحید الدین خاں


اسلامی زندگی
احادیث اور آثار کی روشنی میں
مولانا وحید الدین خاں

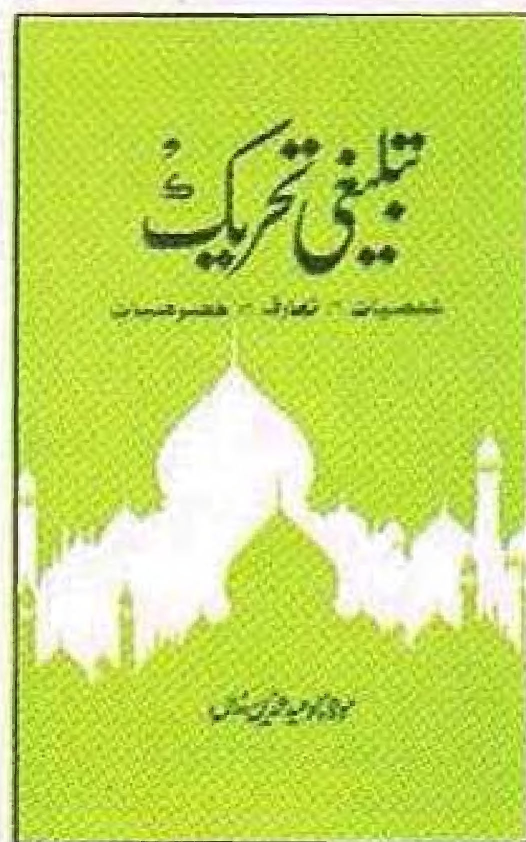

پیغمبرِ انقلاب
سیرت پاک کا علمی اور تاریخی مطالعہ
مولانا وحید الدین خاں

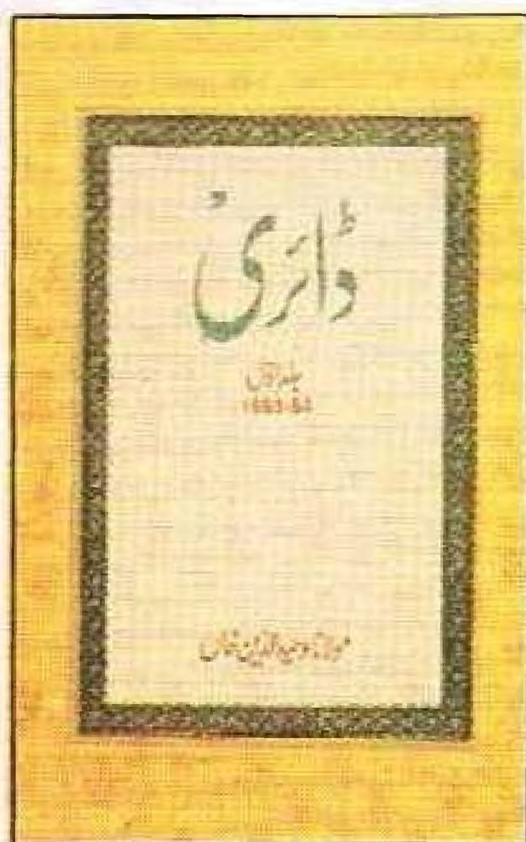

الاسلام
مولانا وحید الدین خاں

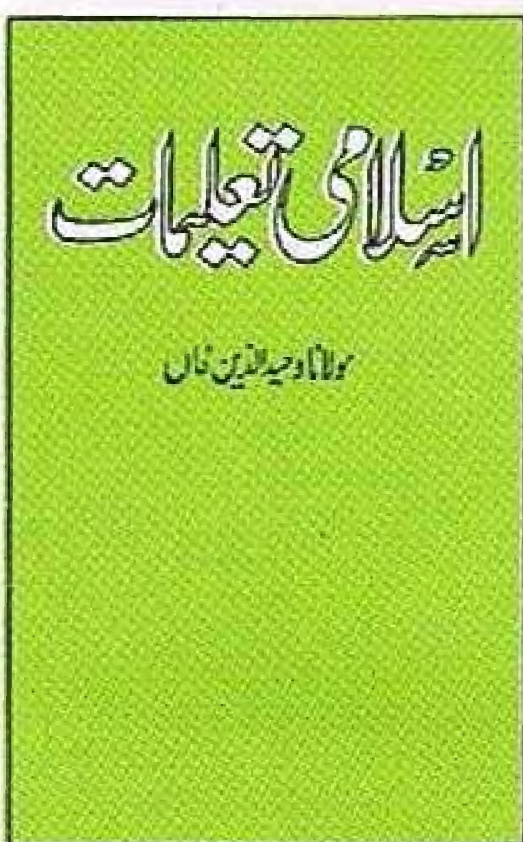

عقلیات اسلام

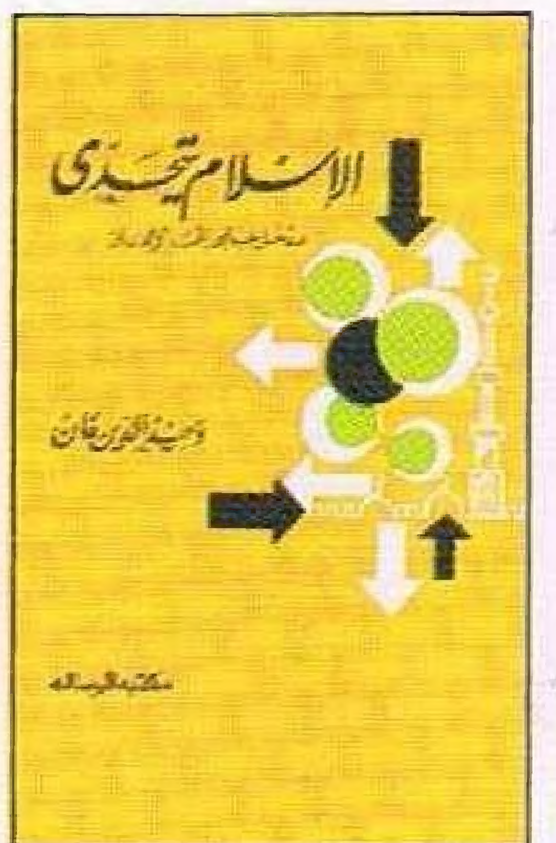

خاتون اسلام
مولانا وحید الدین خاں

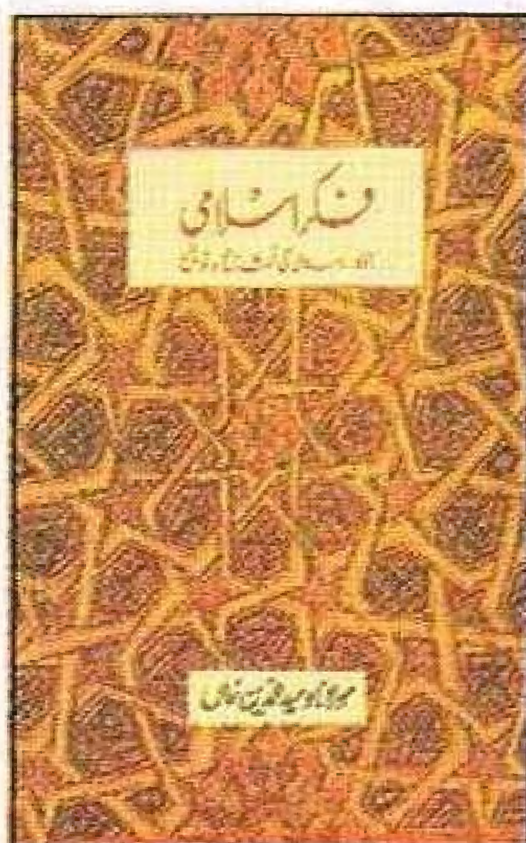

احیاء اسلام

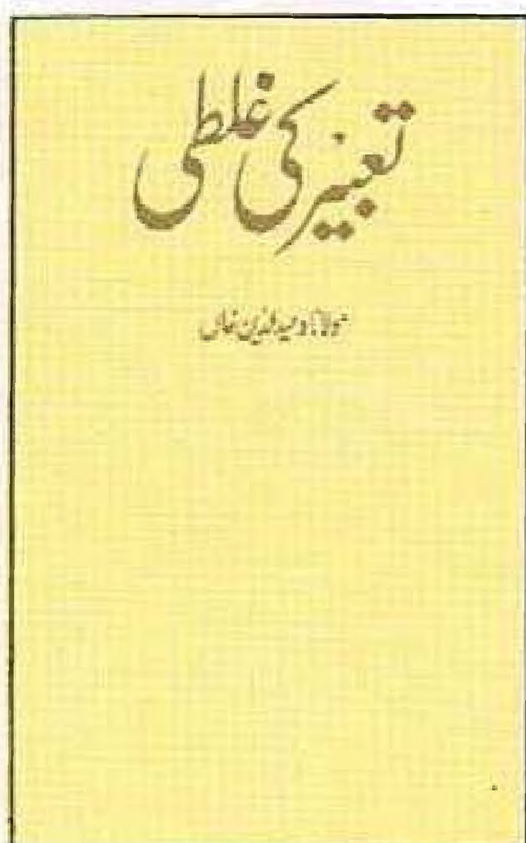

تبلیغی تحریک
مولانا وحید الدین خاں

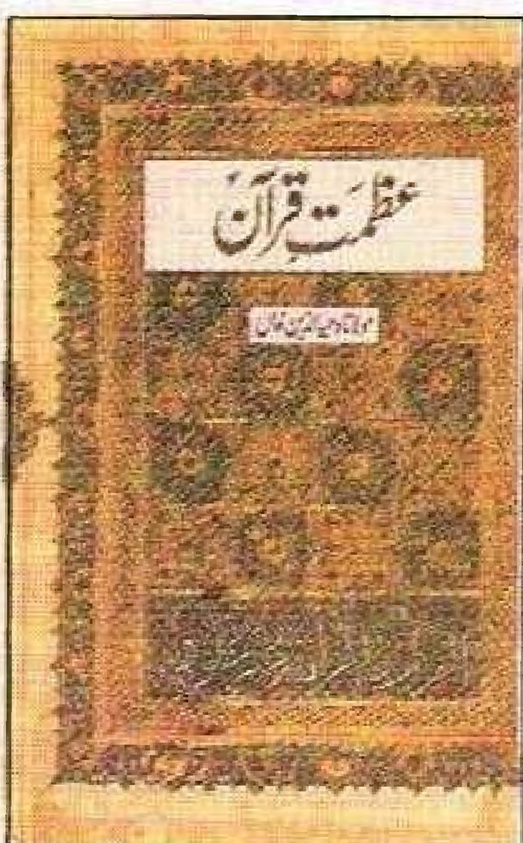

ڈائری
مولانا وحید الدین خاں


اسلامی تعلیمات
مولانا وحید الدین خاں


الاسلام یتحدی
وحید الدین خان
مکتبہ الرسالہ


فکر اسلامی
مولانا وحید الدین خاں


تعبیر کی غلطی
مولانا وحید الدین خاں


عظمت قرآن
مولانا وحید الدین خاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DESU,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
E-mail: risala.islamic.@axcess.net.in.

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of
The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

مارچ ۱۹۹۷ ، شمارہ ۲۴۴

فہرست — صفحہ

ضروری اعلان

• الرسالہ ہندی کی اشاعت بھوپال سے شروع ہوگئی ہے۔

• الرسالہ کے پرانے شمارے صرف ایک روپے میں۔
تفصیل صفحہ ۵۰ پر دیکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے) یہ آیت قرآن میں ایک سو چودہ بار آئی ہے۔ اس تکرار سے اس کی خصوصی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی دوسری آیت نہیں جو قرآن میں اتنی زیادہ بار آئی ہو۔ بندے کے لیے کسی کام کا سب سے بہتر آغاز یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو اپنے رب کے نام سے شروع کرے، وہ ہستی جو تمام رحمتوں کا خزانہ ہے۔ اس کے نام سے کسی کام کا آغاز کرنا گویا اس سے یہ دعا کرنا ہے کہ تو اپنی بے پایاں رحمتوں کے ساتھ میری مدد پر آجا۔ یہ بندے کی طرف سے اپنی بندگی کا اعتراف ہے اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی کی الٰہی ضمانت بھی۔

"میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی یاد سے اپنے کام کا آغاز کر رہا ہوں، یہ کلمہ اپنی روح کے اعتبار سے اس حقیقت کا حامل ہے کہ: السعی منی والاتمام من اللہ اس طرح بندہ ہر کام کے موقع پر یہ کلمہ ادا کر کے اس حقیقت کو تازہ کرتا ہے کہ وہ کسی کام کو شروع کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ کام کو اس کے آخری تکمیل تک پہنچانے کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ سب اللہ کے اختیار میں ہیں، بندے کے اختیار میں آغاز ہے اور اللہ کے اختیار میں تکمیل۔

اس اعتبار سے یہ کلمہ دراصل ایک دعا ہے۔ بندہ اپنے ہر کام کے آغاز میں اس دعائیہ کلمہ کو ادا کر کے خدا سے یہ التجا کرتا ہے کہ اے میرے رب میں نے تیرے اعتماد پر ایک کام شروع کر دیا ہے۔ تو میرے اعتماد کی تکمیل فرما اور میرے حق میں وہ اسباب مہیا فرما دے جس کے ذریعہ میں اپنے اس کام کو مکمل کر سکوں۔ اللہ کے ساتھ اس کی رحمٰن و رحیم کی صفت کا ذکر کرنا گویا کہ یہ کہنا ہے کہ اے اللہ جب تو رحمتوں اور برکتوں والا ہے تو میں تجھ سے یہی امید کرتا ہوں کہ تو ضرور میری دعا قبول فرمائے گا۔

جو کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ گویا صحیح آغاز سے محروم تھا اور جو کام صحیح آغاز سے محروم ہو وہ کبھی صحیح تکمیل تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔

حکیمانہ جواب

امام ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک سنّی اور ایک شیعہ میں جھگڑا ہوا۔ سنی کا دعویٰ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ زیادہ افضل تھے۔ شیعہ حضرت علیؓ کی افضلیت ثابت کر رہا تھا۔ نزاع بڑھی تو یہ طے ہوا کہ اس معاملہ میں ابن جوزی کو حکم بنایا جائے۔ ایک دن جب کہ ابن جوزی منبر پر تقریر کر رہے تھے اس وقت فریقین میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور ان سے پوچھا کہ: من افضل الصحابۃ (یعنی صحابہ میں افضل کون ہے)

ابن جوزی نے جواب دیتے ہوئے کہا: افضل صحابۃ رسول اللہ الذی بنتہ فی بیتہ (یعنی اصحاب رسول میں زیادہ افضلیت والا وہ ہے کہ جس کی بیٹی اس کے گھر میں تھی) امام ابن جوزی نے یہ جواب دیا اور اس کے فوراً بعد مسجد سے باہر چلے گئے تاکہ اس جملہ کی تشریح نہ کرنی پڑے۔

ابن جوزی کا یہ جواب ایسا تھا کہ دونوں فریق مطمئن ہوگئے کہ فیصلہ اس کے عقیدہ کے مطابق ہوا یعنی سنی یہ سمجھا کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ افضل وہ ہے جس کی بیٹی رسول اللہؐ کے گھر میں تھی۔ چوں کہ حضرت ابوبکر کی صاحبزادی حضرت عائشہ رسول اللہؐ کے نکاح میں تھیں اس لیے حضرت ابوبکر افضل ہیں۔ دوسری طرف شیعہ نے مذکورہ جملہ کا یہ مطلب لیا کہ زیادہ افضل وہ ہے جس کے گھر میں رسول اللہؐ کی صاحبزادی تھیں اور چوں کہ آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ حضرت علی کے نکاح میں تھیں اس لیے حضرت علی زیادہ افضل ہوئے۔

یہ جواب کا وہی طریقہ ہے جس کو ٹالنے والا جواب (evasive reply) کہا جاتا ہے۔ اس وقت اگر امام ابن جوزی ایسا جواب دیتے جو واضح طور پر کسی ایک فریق کے حق میں ہوتا تو دوسرا فریق غصہ ہو کر لڑنے لگتا اور پھر شیعہ سنّی فساد کی نوبت آجاتی۔ مگر امام ابن جوزی نے مذکورہ قسم کا ذومعنی جواب دے کر مسلمانوں کو آپس کے جنگ و جدل سے بچا لیا۔

اسی کا نام حکمت کلام ہے۔ کبھی آدمی کو صاف اور واضح جواب دینا پڑتا ہے اور کبھی اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ مبہم انداز میں بات کو بیان کیا جائے۔ حکیم وہ ہے جو ان دونوں کے فرق کو سمجھے اور اپنے کلام میں اس کی رعایت کر سکے۔

اسلام کے سفیر

ام حرام بنت ملحان ایک صحابیہ ہیں۔ ان کا نکاح حضرت عبادہ بن الصامت انصاری سے ہوا۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ بیرونی ملکوں کا سفر کیا۔ اور اب قبرص (Cyprus) میں ان کی قبر ہے۔ ان کی قبر کو وہاں قبر المرأة الصالحة کہا جاتا ہے (حیات الصحابہ ۱/۵۹۲) حضرت خالد بن الولید کی قبر حمص (شام) میں ہے، حالاں کہ وہ مکہ میں پیدا ہوئے تھے۔

یہی معاملہ بیشتر اصحاب رسول کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صحابہ کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ لیکن آج اگر آپ مکہ اور مدینہ جائیں تو وہاں آپ کو بہت کم صحابہ کی قبریں ملیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات عرب سے نکل کر بیرونی ملکوں میں پھیل گئے۔ ان میں اکثر کی وفات ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں ہوئی اور وہیں ان کی قبریں بنیں۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخری زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مدینہ کی مسجد میں جمع کیا اور ان سے کہا کہ اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ تو تم لوگ اختلاف نہ کرو۔ بلکہ تم ملکوں اور شہروں میں جاؤ اور ہر جگہ کے لوگوں تک میری طرف سے میرا پیغام پہنچا دو (فأدّوا عنّي) سیرت ابن ہشام ۴/۲۷۹

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تعلیم تھی جس کی بنا پر اصحاب کرام عرب سے نکل کر بیرونی ملکوں میں پھیل گئے۔ باہر کے ملکوں میں جا کر وہ تجارت کرتے تھے یا محنت سے اپنی روزی کماتے تھے اور لوگوں تک اس پیغام کو پہنچاتے تھے جو ان کو پیغمبر آخر الزماں کے ذریعہ ملا تھا اس طرح ہر شخص اسلام کا سفیر بن گیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام زمین کے چاروں طرف پھیل گیا اور تمام آباد دنیا میں اسلام کے نشانات دکھائی دینے لگے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان معاشی اسباب کے تحت ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ اس طرح دوبارہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ ہر جگہ اسلام کے سفیر کا کام انجام دے سکیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کا یہ سفر صرف معاشی سفر نہ رہے گا بلکہ پورے معنوں میں دعوتی سفر بن جائے گا۔ اس طرح اسلام کی عالمی اشاعت پھر اسی طرح ہونے لگے گی جس طرح وہ دور اول میں ہوئی تھی۔

خدمت میں عزت

پٹنہ کے جناب محمد منہاج اختر، ایم اے (پیدائش ۱۹۷۹) سے یکم جنوری ۱۹۹۷ کو ملاقات ہوئی۔ وہ ایک تاجر ہیں اور پٹنہ میں رہتے ہیں (Tel. 654462)

انھوں نے بہار کا ایک واقعہ بتایا۔ ایک باپ کے دو لڑکے تھے۔ ایک لڑکے نے تعلیم کی طرف رخ کیا۔ محنت کرتے کرتے وہ ڈاکٹر بن گیا۔ اس کے بعد اس نے پریکٹس کر لی اور الگ گھر لے کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے لگا۔ دوسرا لڑکا تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ وہ جاہل رہ گیا۔ آخر کار لوگوں کے مشورہ سے اس نے بستی کے اندر حجامت کی دکان کر لی۔

ڈاکٹر بیٹے کو آبادی کے اندر معزز حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کے مقابلہ میں حجام بیٹا لوگوں کے درمیان ایک غیر معزز فرد بن کر رہ گیا۔ کچھ لوگوں نے ان کے والد سے کہا کہ حجام بیٹا آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ اس بنا پر آپ کو اکثر لوگ فلاں حجام کا والد کہنے لگے ہیں۔ آپ اپنے اس بیٹے کو گھر سے نکال دیجئے۔ اس کے بعد لوگ خود ہی آپ کو "ڈاکٹر صاحب کے والد" کہنا شروع کر دیں گے۔ اور پھر آپ کو سماج کے اندر باعزت جگہ حاصل ہو جائے گی۔ مذکورہ شخص نے جواب دیا۔ میں خود اس کو پسند نہیں کرتا کہ مجھ کو حجام کا والد کہا جائے اور یقیناً اب تک میں اس کو گھر سے نکال چکا ہوتا۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ گھر کا خرچ وہی چلاتا ہے۔ اگر میں اس کو گھر سے نکال دوں تو گھر کا کام چلنا ہی مشکل ہو جائے گا۔

یہ خدمت کا کرشمہ ہے۔ خدمت (service) اپنے اندر معجزاتی تاثیر رکھتی ہے۔ آپ خواہ کچھ بھی ہوں، اگر آپ لوگوں کی خدمت کرنے لگیں، لوگوں کی حاجتوں میں ان کے کام آئیں، ماحول کے اندر آپ کی تصویر یہ بن جائے کہ آپ سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں تو آپ کسی مزید کوشش کے بغیر خود لوگوں کے درمیان عزت اور برتری کا مقام حاصل کر لیں گے۔

خدمت کرنا لوگوں کا دل جیتنا ہے۔ اور جو آدمی لوگوں کا دل جیت لے وہ سب کچھ پا لیتا ہے، اس کے بعد کوئی اور چیز پانے کے لیے باقی نہیں رہتی۔

بااصول زندگی

مومن ایک بااصول انسان ہوتا ہے۔ اس کے معاملات اصولوں کے تحت ہوتے ہیں نہ کہ محض مفاد کے تحت۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اس لیے کرتا ہے کہ باعتبار اصول اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے نہ یہ کہ اس کی خواہش یا اس کا فائدہ تقاضا کرتا ہے کہ ایسا کیا جائے۔

مومن کے کہنے اور کرنے میں فرق نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے وہی کرتا ہے۔ اور جو کرتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جو اس نے کہا ہے۔ اس کی زندگی اس کمزوری سے مکمل طور پر پاک ہوتی ہے جس کو قول وعمل کا تضاد کہا جاتا ہے۔

اس بنا پر مومن سے معاملہ کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ صاحب معاملہ کو پیشگی طور پر یہ یقین ہوتا ہے کہ مومن جو قول دے گا وہ لازمی طور پر اس کی تعمیل کرے گا۔ وہ وہی بات کہے گا جس کو اسے فی الواقع کرنا ہے۔ اور جو کام کرنے کے لیے وہ سنجیدہ نہیں ہے اس کو وہ اپنی زبان سے بھی نہیں دہرائے گا۔

مومن کی شخصیت کا یہ پہلو اس کے پورے وجود کی شناخت بن جاتی ہے۔ اس کا چہرہ اصول پسندی کی روشنی سے منور ہوتا ہے۔ اس کی باتوں میں اصول پسندی کی خوشبو بسی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا کردار سرتاپا اصول پسندی کا کردار ہوتا ہے۔ جب بھی کسی انسان کو اس سے سابقہ پیش آتا ہے تو ہر تجربہ میں اس کو اصول پسندی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ خواہ وہ چھوٹا تجربہ ہو یا کوئی بڑا تجربہ۔

عام لوگ اپنے ذاتی فائدوں کی خاطر جیتے ہیں۔ اِس کے برعکس مومن محکم اصولوں کے تحت جیتا ہے۔ ایک عام انسان اگر مسٹر انٹرسٹ ہوتا ہے تو مومن اس کے بجائے مسٹر پرنسپل۔ انسان تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ اشرف مخلوق ہے۔ اس اعتبار سے وہی شخص انسان کہے جانے کے قابل ہے جو بااصول ہو۔ جو شخص بے اصولی کی زندگی گزارے وہ دراصل انسان ہی نہیں، اگرچہ وہ بظاہر انسان کی صورت میں دکھائی دیتا ہو۔

اصول پسند انسان ہی حقیقی معنوں میں انسان ہے۔ اور اسی حقیقی انسان کا دوسرا نام مومن ہے۔

یہ فرق کیوں

ہر پیغمبر کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ جو لوگ پچھلے پیغمبر کو مانتے تھے، انھوں نے اپنے زمانہ کے پیغمبر کا انکار کر دیا۔ پچھلے پیغمبر کو ماننے والوں کے ساتھ وہ دوستی اور تعاون کا معاملہ کرتے تھے۔ مگر معاصر پیغمبر کے ساتھ انھوں نے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کیا۔ وہ معاصر پیغمبر کو اپنا تعاون دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کا پیغمبر سماجی روایات میں شامل ہو چکا تھا۔ اس کے نام پر ادارے قائم تھے۔ سماج میں ان کا یہ درجہ بن چکا تھا کہ ان کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے میں سماجی عزت حاصل ہوتی تھی۔ پچھلے پیغمبر کے نام پر سرگرم ہونے سے سماج میں حیثیت بلند ہوتی تھی۔ معاصر پیغمبر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ معاصر پیغمبر لوگوں کی نظر میں ابھی ثابت شدہ پیغمبر نہیں بنا تھا۔ اس کی حیثیت ایک نزاعی شخصیت کی تھی۔ نہ کہ مسلّمہ شخصیت کی۔ پچھلے پیغمبر کو پانے کے لیے صرف سماج کا ساتھ دینا کافی تھا۔ جب کہ نئے پیغمبر کو ماننے کے لیے ضروری تھا کہ آدمی کے اندر وہ نگاہ ہو جو سماجی روایات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔

ان دونوں گروہوں کو تقلیدی ذہن اور انقلابی ذہن کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہر زمانہ میں بیشتر لوگ تقلیدی ذہن کے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر زمانہ میں پچھلی قائم شدہ شخصیتوں کے نام پر بھیڑ اکٹھا رہتی ہے۔ مگر نئی شخصیت غیر قائم شدہ ہونے کی بنا پر صرف انھیں غیر معمولی افراد کو متاثر کر پاتی ہے جو انقلابی ذہن کے حامل ہوں۔ جو خارجی چیزوں سے اوپر اٹھ کر حقیقت کی سطح پر باتوں کو دیکھیں اور گہری بنیادوں پر آزادانہ فیصلہ کر سکیں۔

خدا کو وہ ایمان مطلوب نہیں ہے جو عوامی رواج یا سماجی تقلید کے زیر اثر بنا ہو۔ خدا کو وہ ایمان مطلوب ہے جو اس طرح حاصل ہو کہ وہ آدمی کی اپنی دریافت بن جائے۔ یہ وہ ایمان ہے جس میں آدمی درمیانی پردوں کو پھاڑ کر براہ راست خدا کو پالیتا ہے، وہ ظواہر سے گزر کر اصل حقیقت تک براہ راست پہنچ جاتا ہے۔

ان میں سے ایک معرفت ہے اور دوسرا صرف تقلید۔

اختلاف

اختلاف ایک پرچۂ امتحان ہے۔ کسی سے آپ کا اختلاف پیدا ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ اللہ نے آپ کو ایک نازک آزمائش میں ڈال دیا تاکہ یہ جانے کہ آپ سچے مومن ہیں یا سچے مومن نہیں ہیں۔

اختلاف کو اختلاف کے دائرہ میں رکھنا سچے اہل ایمان کا طریقہ ہے۔ جو لوگ اختلاف کو تخریب کاری کے درجہ تک پہنچا دیں وہ بلاشبہہ ایمان و اسلام سے نکل گئے۔

آدمی جب اختلاف کو اختلاف کے دائرہ میں رکھے تو اس کا امکان ہوتا ہے کہ تبادلۂ خیال کے دوران دونوں میں سے کسی کے اوپر سچائی کھل جائے اور اس طرح جو بھٹکے ہوئے مسافر کی مانند تھا وہ دوبارہ صحیح راستہ پر آجائے۔

مگر جب ایک آدمی اختلاف کو تخریب کاری تک پہنچا دے تو اس کے بعد گمراہی کے گڑھے میں گرنے کے سوا کوئی انجام اس کے لیے باقی نہیں رہتا۔ ایسے آدمی کا دماغ منفی سوچ کا کارخانہ بن جاتا ہے۔ وہ دلیل اور الزام تراشی کے فرق کو سمجھنے کی اہلیت کھو دیتا ہے۔ وہ منصفانہ اختلاف کی حد سے گزر کر ظالمانہ اختلاف کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کی پکڑ کے احساس سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اپنی انا کو رہنما بنا لیتا ہے۔ اب اس کا مقصد حق کو قائم کرنا نہیں ہوتا بلکہ صرف اپنی ذات کو قائم کرنا اس کا اول و آخر مقصد بن جاتا ہے۔ وہ خدا کی رحمت سے دور ہو کر پوری طرح شیطان کی گرفت میں آجاتا ہے۔

اختلاف پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر اختلاف کو تخریب کاری بنانا سراسر ظالمانہ فعل ہے۔ جو لوگ اختلاف کو تخریب کاری بنائیں ان کے لیے سخت خطرہ ہے کہ وہ خدا کی شدید پکڑ میں آجائیں۔ عین ممکن ہے کہ آخرت میں ان سے کہہ دیا جائے کہ آج تم نے دنیا کی زندگی میں شیطان کو اپنا رہنما بنایا۔ اب آخرت کی خدائی نعمتوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔

اختلاف کے وقت عدل پر قائم رہنا آدمی کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے۔ اور اختلاف کے وقت عدل و انصاف سے ہٹ جانا آدمی کو جہنم کے دروازے پر پہنچا دیتا ہے۔

بوسٹر کا رول

فردوسی کا شاہنامہ فارسی زبان کا ایک مشہور رزمیہ ہے۔ اس میں ایران کے رستم اور دوسری شخصیتوں کا پر فخر تذکرہ ہے۔ رستم کے سلسلہ میں فردوسی نے کہا کہ یہ میں ہوں جس نے رستم کو رستم بنایا ورنہ وہ ایران کے ایک قصبہ کا ایک معمولی پہلوان تھا:

منش کردہ ام رستم پہلواں   وگرنہ یلے بود در سیستاں

فردوسی نے اپنے شعر میں جو بات ذاتی فخر کے طور پر کہی ہے وہ درحقیقت فطرت کا ایک قانون ہے۔ جس طرح والی بال کے کھیل میں ایک بوسٹر ہوتا ہے اور ایک وہ جو والی مارتا ہے، بوسٹر کا کام ہے بال کو آگے بڑھانا اور والر کا کام ہے اس کو لے کر والی مارنا، اس طرح والی بال کا کھیل جاری رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح زندگی کے نظام میں خود خدا کے نقشۂ تخلیق کے مطابق ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو بڑھاوا دے اور اس طرح وہ اس کو آگے پہنچا دے۔

یہ اصول اتنا عام ہے کہ پیغمبر تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مثال کے طور پر حضرت یوسفؑ مصر میں ایک غلام کی حیثیت سے داخل ہوئے پھر وہ جیل میں پہنچا دیے گئے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ انھیں مصر کی حکومت میں اعلیٰ ترین منصب حاصل ہو گیا۔ ان کی یہ ترقی اللہ کے منصوبہ کے تحت تھی۔ تاہم ظاہری طور پر مصر کے بادشاہ نے ان کے لیے بوسٹر (بڑھانے والا) کا رول ادا کیا۔

یہی بات ہر اس شخص کے سلسلہ میں نظر آتی ہے جس کو کسی حیثیت سے کوئی نمایاں مقام حاصل ہوا۔ اس حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو ہر آدمی کے پیچھے کوئی بوسٹر دکھائی دے گا۔ انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی شخصیت ہو جس کے آگے بڑھنے میں کسی بوسٹر کا دخل شامل نہ ہو۔

اس معاملہ میں بوسٹر کو کسی تعلّی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کی وجہ سے فلاں شخص آگے بڑھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بوسٹر اگر غیر جانبدارانہ طور پر غور کرے تو وہ خود بھی پائے گا کہ اس کی اپنی ذات کے معاملہ میں بھی کسی بوسٹر کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ بوسٹر کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ اس کا ذاتی کارنامہ نہ تھا بلکہ یہ دراصل خدا تھا جس نے اس کو اپنی ایک منشا کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔

توازن قائم رکھئے

کھلاڑی ایک کھیل دکھاتے ہیں جس کو ٹائٹ روپ واکنگ (tight-rope walking) کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ ہوتا ہے میدان میں دو کھمبا گاڑ کر اس کے اوپر ایک موٹی رسّی تان دی جاتی ہے۔ اس رسّی کے اوپر ایک لڑکا پاؤں رکھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ میں ایک لمبا بانس ہوتا ہے۔ اس بانس کے ذریعہ توازن (بیلنس) قائم کرتے ہوئے وہ تنی ہوئی رسّی پر چلتا ہے یہاں تک کہ وہ اِس سرے سے اُس سرے تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ صرف ٹائٹ روپ کھلاڑی کی بات نہیں۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک آدمی جب زمین پر چل رہا ہوتا ہے تو ہر آن وہ گویا کہ ٹائٹ روپ واکر ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ چلتے ہوئے دائیں طرف کچھ زیادہ جھک جائے تو وہ دائیں طرف گر جائے گا۔ اور اگر وہ بائیں طرف زیادہ جھک جائے تو وہ بائیں طرف گر جائے گا۔ آدمی دونوں طرف توازن قائم کرتے ہوئے چلتا ہے، اسی لیے وہ کامیابی کے ساتھ راستہ طے کر پاتا ہے۔ ورنہ وہ زمین پر اِدھر یا اُدھر گر پڑے۔

یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ اس دنیا میں انسان کی پوری زندگی ٹائٹ روپ واکنگ کی زندگی ہے۔ یہاں اس کو مختلف اور متضاد تقاضوں کے درمیان توازن قائم کرتے ہوئے چلنا پڑتا ہے۔ اسی توازن کو برقرار رکھنے کا نام کامیابی ہے اور اسی توازن کے بگڑ جانے کا نام ناکامی۔

خاندانی زندگی میں آدمی کو مختلف رشتہ داروں کے درمیان توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ سماجی زندگی میں آدمی کو مختلف گروہوں کے درمیان توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ بین اقوامی زندگی میں لیڈروں کو مختلف ملکوں اور مختلف حکومتوں کے درمیان توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ توازن کے اس مسئلہ سے انسانی زندگی کا کوئی بھی گوشہ خالی نہیں۔

اس توازن کو کامیابی کے ساتھ برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی سوچی سمجھی زندگی گزارے۔ وہ ہر آن محتاط رہے۔ وہ ہر لمحہ اپنا محاسبہ کرتا رہے۔ وہ اپنے تعصبات کے خول سے باہر آکر جینا سیکھے۔ وہ اپنی ذات کا لحاظ کرنے کے ساتھ دوسروں کا لحاظ کرنے والا بھی بنے۔ جو لوگ اس طرح دوطرفہ رعایت کی زندگی گزاریں وہی اس دنیا میں کامیابی کا درجہ حاصل کریں گے۔

ماضی اور حال

ایک باپ کے پاس ایک زرخیز زمین تھی اس نے اس میں کچھ بیج بوئے اور اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں تو شاید زندہ نہ رہوں لیکن بیس سال بعد تم یہاں پھل دار درختوں کا ایک باغ دیکھو گے اور اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ ۲۰ سال گزرنے کے بعد بیٹوں نے اس زمین کو دیکھا، وہاں صرف چٹیل میدان تھا وہاں نہ کوئی درخت تھا اور نہ پھل۔

بیٹوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ باپ نے نادانی کے تحت پتھروں کے ٹکڑوں کو بیج سمجھ لیا تھا۔ باپ نے زمین میں پانی دیا اور کچھ چیز بکھیری، مگر وہ بیج نہیں تھے، پتھر کے ٹکڑے تھے۔ ظاہر ہے کہ درخت کا باغ بیج سے نکلتا ہے نہ کہ پتھر کے ٹکڑوں سے۔

اگر کسی قوم کو آپ دیکھیں کہ اس کے رہ نما ماضی میں سو سال تک بڑی بڑی تحریکیں اٹھاتے رہے۔ وہ قوم کے سامنے خوشنما الفاظ بولتے رہے اور اس کو بڑی بڑی امیدیں دلاتے رہے۔ مگر حال میں وہ قوم اس طرح داخل ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت صرف ایک تباہ حال گروہ کی ہے۔ اس کا کوئی بھی معاملہ درست نہیں۔ کسی بھی پہلو سے اس کے قدموں کے نیچے وہ مستحکم زمین نہیں۔ جس پر قومیں کھڑی ہوتی ہیں۔

ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ماضی کے رہ نماؤں نے درخت کے بیج نہیں بوئے تھے بلکہ بیج کے نام پر پتھر کے ٹکڑے بکھیرے تھے اور پتھر کے ٹکڑے کبھی کسی قوم کے لیے لہلہاتے ہوئے باغ نہیں بنتے۔

حال ہمیشہ ماضی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جیسا ماضی ویسا حال۔ کوئی فرد یا کوئی گروہ اگر ایسے حال کا وارث بنے، جس میں اس کے لیے کچھ نہ ہو تو ایسے فرد یا گروہ کو اغیار کے ظلم اور سازش کی شکایت نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ ماضی میں کوئی حقیقی عمل نہ کرسکا۔ اس لیے حال میں کوئی حقیقی نتیجہ بھی اس کے حصہ میں نہیں آیا۔

ماضی کے لیے اپنی کوتاہی کا اعتراف حال میں عمل کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ایسا آدمی از سر نو عمل کرکے حال میں وہ چیز پالیتا ہے جس کو وہ ماضی میں نہ پاسکا تھا۔

شملہ کا سفر

اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام شملہ میں ۵ ۔ ۶ جولائی ۱۹۹۴ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس دو روزہ کانفرنس کا موضوع تھا:

Redefining the good society

اس کانفرنس کی دعوت پر شملہ کا سفر ہوا۔ یہ شملہ کے لئے میرا پہلا سفر تھا۔ ذیل میں اس سفر کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۴ جولائی ۱۹۹۴ کو صبح ۵ بجے گھر سے روانگی ہوئی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ مگر فضا میں اجالا پھیل چکا تھا۔ جو لبتیاں رات کے اندھیرے میں گم تھیں وہ صبح کی روشنی میں نمایاں ہوتی جارہی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ آفاقی ماحول خاموش زبان میں کہہ رہا ہے کہ جھوٹ اور سچ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ جھوٹے پروپگنڈوں کا طوفان تھوڑی دیر کے لئے حقیقت کو چھپا سکتا ہے۔ مگر خود فطرت کے نظام کے تحت یقینی ہے کہ سچائی کا آفتاب طلوع ہو اور جھوٹے پروپگنڈوں کا اس طرح خاتمہ کر دے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

منتظمین نے سفر کا انتظام ہمالین کوئن اکسپرس سے کیا تھا۔ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو انسانوں کی ایک بھیڑ آتی اور جاتی نظر آئی۔ ریلوے کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر پر ٹرینوں کے بارہ میں مختلف اعلان کیا جارہا تھا۔ ہمالین کوئن کے بارہ میں بتایا گیا کہ وہ اپنے سمے پر ٹھیک ۶ بجے روانہ ہوگی۔ البتہ آج خلاف معمول اس کی روانگی کا انتظام پلیٹ فارم نمبر ا سے کیا گیا تھا۔

پلیٹ فارم پر پہنچے تو "اے سی فرسٹ" کی دو اسپیشل بوگی سامنے نظر آئی۔ یہ کانفرنس کے شرکاء کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ میری کیبن میں میرے علاوہ پی آر چاری (IAS) تھے۔ اس طرح کے کیبن میں عام طور پر چار مسافر ہوتے ہیں۔ مگر اس میں صرف ہم دو آدمی تھے۔ بوگی کے اندر کھانے وغیرہ کے تمام انتظامات ہوائی جہاز کے فرسٹ کلاس کے معیار پر کئے گئے تھے۔

راستہ میں ٹائمس آف انڈیا (۴ جولائی ۱۹۹۴) پڑھا۔ اس میں ایک رپورٹ بہتر زندگی (Living Better) کے زیر عنوان تھی۔ ڈاکٹر رانی راؤ نے لکھا تھا کہ ریسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ چلنا

ایک صحت مند عمل ہے۔ چلّانے کو روکنا نہیں چاہئے۔ کیوں کہ ذہنی تناؤ کو ختم کرنے کے لئے چلّانا بہت ضروری ہے:

Crying is very crucial for relieving tension. It should not be suppressed.

میرے ہم سفر مسٹر پی آر چاری نے کہا کہ ایڈ منسٹریٹر کی حیثیت سے میرا تجربہ ہے کہ جو جلوس جوشیلے نعرے لگاتا ہوا آرہا ہے وہ خطرناک نہیں ہے۔ البتہ جو جلوس خاموش مظاہرہ کررہا ہو وہ زیادہ خطرناک ہے۔ کیوں کہ نعرہ باز جلوس تو اپنا ٹنشن خود ہی نکال رہا ہے۔ جب کہ خاموش جلوس کے ٹنشن کو نکالنا آپ کی ہوشیاری پر منحصر ہے۔

باہر دونوں طرف سرسبز مناظر تھے جن کے درمیان سے ہماری ٹرین گزر رہی تھی۔ کیبن میں مسٹر پی آر چاری تھے جو اپنے تجربات سنا رہے تھے۔ اس طرح سفر بہت آسانی کے ساتھ طے ہوتا رہا۔ اس طرح کے مواقع پر میں خود بہت کم بولتا ہوں۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں سوال کرتا رہتا ہوں اور اس طرح دوسرے کو بولنے کا موقع دیتا ہوں۔ یہی میں نے مسٹر چاری کے ساتھ کیا۔ اکثر میرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اپنا کوئی خاص انبھو بتائیے۔ آپ کی زندگی کی خاص دریافت کیا ہے۔ ان سے بھی میں نے اسی قسم کے سوالات کئے۔ انھوں نے اپنے کئی قصے بتائے۔

مسٹر چاری (آئی اے ایس) اس سے پہلے کلکٹر تھے، پھر وہ سکریٹری کے عہدہ تک پہنچ گئے۔ اب انھوں نے انتظامی سروس سے پیشگی ریٹائرمنٹ لے لیا ہے۔ کیبن میں چوں کہ صرف ہم دو آدمی تھے، ان سے کافی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے ایک بڑا اسبق آموز تجربہ بتایا۔

انھوں نے بتایا کہ ۳۰ سال پہلے وہ مدھیہ پردیش کے ضلع چھترپور میں کلکٹر تھے۔ وہاں ان کا کلکٹریٹ کا آفس راجہ کے قدیم محل میں تھا۔ جون ۱۹۶۵ کا واقعہ ہے، وہ اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے کہ وائرلیس پر پولیس افسر کا یہ پیغام ملا کہ شہر کے ہندوؤں کی ایک بھیڑ کلکٹریٹ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم کلکٹر کو ایک میمورنڈم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ لوگ بپھرے ہوئے ہیں اور آپ کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگا رہے ہیں۔ آپ اجازت دیں کہ ہم فورس کو استعمال کرکے انھیں یہیں روک دیں۔ اگر وہ کلکریٹ تک پہنچ گئے تو وہ ضرور تشدد کریں گے۔

مسٹر چاری نے بتایا کہ میں نے پولیس افسر کی رپورٹ پر اعتماد نہیں کیا۔ بلکہ اپنا آدمی بھیجا کہ

جا کر معلوم کرو کہ حقیقی صورت حال کیا ہے۔ آدمی نے بتایا کہ پولیس افسر کی رپورٹ تو درست ہے۔ البتہ وہ لوگ سخت دھوپ سے پسینہ پسینہ ہو رہے ہیں اور پیاس کی وجہ سے ان کے گلے اتنے سوکھ گئے ہیں کہ نعرہ لگانا بھی ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ مسٹر چاری نے فوراً اپنے ڈپٹی کلکٹر سے کہا کہ بہت سی بڑی بڑی ناند منگواؤ اور اس میں ٹھنڈا پانی بھر کر کلکٹریٹ کے سامنے کے میدان میں رکھوا دو۔ اور وہاں پینے کے لئے بہت سے کوزے بھی رکھ دو۔

فوراً اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب جلوس والے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ٹھنڈا پانی وہاں بڑی مقدار میں موجود ہے۔ تمام لوگ پانی پر ٹوٹ پڑے۔ ہر ایک نے جی بھر کر پانی پیا۔ اس کے بعد اپنے آپ تمام لوگ ٹھنڈے ہو گئے۔ جلوس کے لیڈر کلکٹر صاحب کے دفتر میں آ کر ان سے ملے۔ مگر انھوں نے نہ سخت کلامی کی اور نہ کوئی تشدد کیا۔ بلکہ کلکٹر سے معافی مانگ کر ہنستے ہوئے چلے گئے۔

مسٹر چاری نے یہ واقعہ مجھ سے ٹرین میں بیان کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کو ان کے حوالے سے کانفرنس کی صدارتی تقریریں دہرایا۔ مسٹر چاری نے بعد کو بتایا کہ کانفرنس کے ایک ڈیلی گیٹ (مسٹر پی این دھر) ان سے پوچھ رہے تھے کہ یہ واقعہ ہے یا افسانہ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے اعلیٰ ترین دماغ بھی مثبت انداز میں سوچنے سے کس قدر عاجز ہیں۔

ایک صاحب نے زمانہ کا فرق بتاتے ہوئے کہا ہے کہ جب ریلوے ٹرین ایجاد ہوئی تو کہا جانے لگا کہ تاریخ ٹرین کے ذریعہ سفر کرتی ہے:

History travels by train.

اب زمانہ کی تیز رفتاری بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ چنانچہ آج کہا جاتا ہے کہ تاریخ فیکس مشینوں کے ذریعہ سفر کرتی ہے:

History travels by Fax machines.

ایک ہم سفر نے کہا کہ ہم لوگوں کی سوچ زمانہ کی رفتار کے مطابق نہیں۔ ہم نے ہندی زبان کو پہلے نیشنل لینگویج کہا۔ مگر وہ ناکام ہو گیا۔ اب ہم ہندی کو لنک لینگویج کا نام دے رہے ہیں۔ پہلے ہم نے ریجنل زبانوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اب ہندی کو لنک لینگویج کہہ کر ہم ریجنل زبانوں کی اہمیت کا اعتراف کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے اندر دور اندیشی کی کمی ہماری ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے۔

ہماری سوچ زمانہ سے بہت پیچھے ہے۔

دن میں گیارہ بجے ہماری ٹرین کالکا پہنچی۔ یہاں سے ہمارا قافلہ گاڑیوں کے ذریعہ آگے روانہ ہوا۔ ریلوے اسٹیشن سے پہلے ہم لوگ ہوٹل شوالک لے جائے گئے۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنا تھا۔ میں نے غسل کیا۔ پھر مسٹر انور جعفری (بھوپال) سے تبادلہ خیال کرتا رہا۔ آخر میں ہوٹل کی طعام گاہ میں لمبی میز پر سب لوگوں نے اکھٹے کھانا کھایا۔ یہیں ظہر کی نماز پڑھی۔

ہوٹل شوالک میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میرے ایک دوست فرقہ پرستی کے بہت مخالف ہیں۔ چنانچہ انھوں نے انگریزی میں ایک میگزین نکالا ہے جس کا نام ہے ــــــ فرقہ پرستی سے لڑو (Combat Communalism) میں نے کہا کہ زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اخوت کو فروغ دو (Promote Brotherhood) کے نام سے اپنا میگزین نکالتے۔

میں نے کہا کہ وہ لوگ جن کو فرقہ پرست کہا جاتا ہے، وہ کوئی بھیڑیوں کی مانند ہم سے الگ نوع نہیں ہیں۔ وہ بھی ہماری ہی طرح کے انسان ہیں۔ ان کے اندر بھی وہی فطرت ہے جو ہمارے اندر ہے۔ البتہ ان کی فطرت پر کچھ عارضی پردے پڑ گئے ہیں۔ آپ حکمت سے ان پردوں کو ہٹا دیجئے۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ بھی آپ ہی کی طرح شریف انسان بن گئے ہیں۔

ڈیڑھ بجے کالکا سے شملہ کے لئے روانگی ہوئی۔ میں جس کار میں تھا اس میں میرے ساتھ جسٹس آر ایس پاٹھک بھی تھے۔ وہ چیف جسٹس آف انڈیا رہ چکے ہیں۔ انٹرنیشنل کورٹ میں وہ دو سال تک رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے واقعات بتائے۔ راجیو گاندھی کی حکومت کے زمانہ میں شاہ اردن کی دعوت پر وہ چار روز کے لئے اردن بھی جا چکے ہیں۔ جسٹس پاٹھک سے میں نے کہا کہ آپ نے انڈیا کے اندر اور انڈیا کے باہر بہت کچھ دیکھا ہے۔ آپ اپنا کوئی انوکھا واقعہ (incident) بتائیے۔ مگر اس وقت انھوں نے ایسا کوئی واقعہ نہیں بتایا۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ پھر بتائیں گے۔

جسٹس آر ایس پاٹھک نے بتایا کہ جب وہ انٹرنیشنل کورٹ میں پہنچے اور پہلا فیصلہ لکھا تو میرا فیصلہ رد کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ میں نے اسی عام زبان میں لکھا تھا جس کا میں ہندستان کی عدالت میں عادی ہو چکا تھا۔ یعنی ایک فریق کی جیت اور دوسرے فریق کی ہار کا اعلان ۔ مگر

انٹرنیشنل کورٹ کے فیصلوں میں یہ زبان نہیں چلتی۔ وہاں فریقین کی سماعت کے بعد جج جب فیصلہ دیتا ہے تو اس کو وہ ایسی زبان میں لکھتا ہے کہ جیتنے والا تو اس میں فاتح نظر آئے مگر ہارنے والا بھی اپنے کو مفتوح نہ سمجھے۔

کالکا سے شملہ کا سفر بذریعہ روڈ طے ہوا۔ یہ سفر تقریباً تین گھنٹہ کا تھا۔ پورا راستہ سرسبز وادیوں کے درمیان سے گزرا۔ میں نے سوچا کہ یہ مناظر کتنے حسین ہیں۔ ان کو دیکھ کر جی چاہنے لگتا ہے کہ انھیں کے درمیان زندگی گزاری جائے۔ مگر جب آدمی یہاں شہر بساتا ہے تو طرح طرح کی آلودگی بہت جلد اس کے حسن کو غارت کر دیتی ہے۔ اور اگر شہر نہ بسایا جائے تو انسان جیسی مخلوق کے لئے ان کے درمیان زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ کیسا عجیب عجز ہے جس سے انسان اس دنیا میں دوچار ہے۔ شاید یہی مطلب ہے اس آیت کا کہ —— لقد خلقنا الانسان فی کبد۔

ہماری کار کے ڈرائیور گردیال سنگھ تھے۔ ان سے میں نے گاڑی چلانے کی بابت سوالات کئے۔ انھوں نے کہا کہ گاڑی چلاتے ہوئے ہم کو ہر وقت سجگ رہنا پڑتا ہے۔ اگر ہم آپ ٹھیک چل رہے ہیں، دوسرا غلط آگیا تو اس سے بھی ہمیں کو بچاؤ کرنا پڑتا ہے۔

دوسری بات انھوں نے میدانی سفر اور پہاڑی سفر کے بارہ میں بتائی۔ انھوں نے کہا کہ میدان میں تو سڑک دور تک دکھائی دیتی ہے۔ وہاں آپ گاڑی کو تیز بھی دوڑا سکتے ہیں۔ مگر پہاڑی سڑکوں پر آپ ۳۰۔۳۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں جا سکتے۔ یہاں بار بار موڑ آتا ہے۔ آپ کو پتہ نہیں ہوتا کہ موڑ کے ادھر کیا ہے۔ اس لئے ہم کو سلو چلنا پڑتا ہے، ورنہ ٹکراؤ کا بہت ڈر ہے۔ راستہ میں کئی جگہ گاڑیاں الٹی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ شاید وہی لوگ ہیں جنھوں نے پہاڑی سڑک پر بھی اپنی گاڑی اس طرح دوڑانی شروع کر دی تھی جیسے کوئی شخص میدانی سڑک پر گاڑی دوڑاتا ہے۔

ایک جگہ لینڈ سلائڈ ہوا تھا۔ مٹی اور پتھر بہت بڑی مقدار میں اوپر سے گر کر سڑک پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ تاہم یہ سڑک کافی چوڑی ہے۔ اس لئے ملبہ آدھی سڑک تک پھیلا۔ وہ پوری سڑک پر پھیل کر سواریوں کے لئے رکاوٹ نہ بن سکا۔

سڑک کے ذریعہ تقریباً ڈھائی گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم " بادلوں " کے اندر داخل ہو گئے۔ شملہ ۲۲۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اس لئے یہاں موسم بالکل بدل جاتا ہے۔ یہاں آتے ہی ہم بادلوں کی اونچائی پر پہنچ جاتے ہیں۔

زمین پر جس طرح کبھی کبھی کہر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہاں ہر طرف بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ سے سڑک پر کسی قدر اندھیرا ہو گیا تھا۔ اس طرح بادلوں کے درمیان چلتے ہوئے ہم شملہ میں داخل ہو گئے۔

شملہ میں میرا قیام ہوٹل ہالی ڈے ہوم (کمرہ نمبر ۳۰۶) میں تھا۔ میدانی ہوٹلوں کی طرح اس سے ملحق لان اور گارڈن نہیں ہیں۔ پہاڑوں کے اوپر جو ہوٹل بنائے جاتے ہیں وہ عام طور پر ایسے ہی ہوتے ہیں۔

یہاں ایک سرکاری افسر سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ جب میں طالب علم تھا تو میرے بہت سے دوست تھے۔ پھر جب میں جونیئر افسر کی پوسٹ پر تھا تب بھی میرے دوستوں کی تعداد کافی تھی۔ مگر جب میں ترقی کر کے اعلیٰ افسر بن گیا تو میرے دوست بہت کم ہو گئے۔ میں نے پوچھا کہ اس کی وجہ آپ کے خیال سے کیا ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ رقابت (rivalry) اسی کو مذہب کی اصطلاح میں حسد کہا جاتا ہے۔

حسد کا مرض اس دنیا میں بہت زیادہ عام ہے۔ بلکہ شاید کوئی بھی شخص اس جذبہ سے خالی نہیں۔ دوسرا آدمی جب تک آپ کو اپنے سے کم یا برابر دکھائی دے، آپ کے احساسات اس کے بارہ میں نارمل رہتے ہیں۔ مگر جب آپ کو محسوس ہو کہ دوسرا شخص عہدہ یا مال یا شہرت میں آپ سے آگے بڑھ گیا ہے تو فوراً آپ کے اندر اس کے خلاف جلن پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ اس کی کاٹ کرنے لگتے ہیں تاکہ اس کو غلط بتا کر اپنے اس جذبہ کو تسکین دیں کہ اب بھی آپ اس سے بلند ہیں۔

یہ نفسیاتی کمزوری کبھی شعوری طور پر آدمی کے اندر آتی ہے لیکن زیادہ تر آدمی کے دماغ میں غیر شعوری طور پر داخل ہو جاتی ہے۔ بطور خود آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے اندر کسی کے خلاف جلن اور حسد نہیں۔ حالاں کہ آپ مکمل طور پر حسد کی ذہنیت کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں۔

شملہ ہماچل پردیش کا صدر مقام ہے۔ وہ ہمالیہ کے اوپر ۲۲۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ وہ ہندستان کے چند انتہائی مشہور پہاڑی مقامات میں سے ایک ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ تقریباً ۳۰۰ کیلو میٹر ہے۔

شملہ کو ۱۶-۱۸۱۴ میں انگریزوں نے بسایا تھا۔ اس وقت اس کا مقصد برطانی فوجی دستوں کو وہاں رکھنا تھا۔ بعد کو وہ گرمیوں کا موسم گزارنے کے لئے ایک مقبول پہاڑی مقام بن گیا۔ ۱۸۶۵ سے ۱۹۳۹ تک وہ گرمیوں کے لئے ملک کی راجدھانی رہا۔

جب تک میں نے شملہ کو نہیں دیکھا تھا، شملہ ایک افسانوی شہر معلوم ہوتا تھا۔ مگر دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بھی دوسری بستیوں کی طرح ایک بستی ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں فطرت کا حسن ہوگا۔ صحت بخش ہوا لوگوں کو ملتی ہوگی۔ سکون کا ماحول نظر آتا ہوگا۔ مگر آج وہ شملہ کہیں موجود نہیں۔ اس کے راستوں میں چلتے ہوئے میرا احساس یہ تھا کہ یہ گویا مکانوں کا ایک جنگل ہے جس میں کچھ انسان نما مخلوق ہر طرف بھیڑ لگائے ہوئے ہے۔ پچاس سال پہلے کا شملہ اب یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

جیسے ہی ہماری گاڑی شملہ کے اندر داخل ہوئی، اس سے میری دلچسپیاں ختم ہوگئیں۔ میں دن اور گھنٹہ گننے لگا کہ کب یہاں سے واپسی ہوگی۔ مجھ کو فطرت کا ماحول پسند ہے۔ مگر آج کے شملہ کے لئے فطرت کا حسن ایک قصۂ ماضی بن چکا ہے۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو ہندستان پر برطانیہ کی حکومت قائم تھی۔ اس نے ہندستان کو بھی جنگ میں شریک کر دیا۔ مہاتما گاندھی کو اس سے اختلاف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندستان ایک عدم تشدد کا ملک ہے۔ اس کو تشدد کے معاملہ میں فریق نہیں بننا چاہئے۔

وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے بذریعہ ٹیلی گرام مہاتما گاندھی کو شملہ آنے کی دعوت دی تاکہ اس مسئلہ پر گفت گو کی جاسکے۔ مہاتما گاندھی فوراً ٹرین سے سفر کر کے شملہ پہنچے۔ لوئی فشر کی رپورٹ کے مطابق، مہاتما گاندھی نے شملہ میں کہا کہ میں خدا سے پوچھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی متشددانہ چیزوں کو ظہور میں آنے کی کیوں اجازت دیتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عدم تشدد ناکام ہوگیا اور خدا بھی ناکام ہوگیا:

non-violence had failed, God had failed. (p. 350)

مگر اس تبصرہ کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ دوسری عالمی جنگ ہٹلر نے چھیڑی تھی۔ یہ جنگ کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک سرکش انسان نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے جنگ چھیڑی۔ مگر خدا نے اس جنگ کی آگ کو بجھا دیا۔ اس کو زیادہ بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔

۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش کی جنگ کے بعد پاکستان کے ۹۰ ہزار فوجی گرفتار ہو کر ہندستان لائے گئے۔ اس وقت ذو الفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیر اعظم تھے۔ وہ اپنے فوجیوں کو چھڑا کر لے جانے کے لئے ہندستان آئے۔ مسز اندرا گاندھی سے ان کی بات چیت بھی شملہ میں ہوئی۔ آخر کار وہ اتفاق نامہ طے پایا جس کو شملہ ایگریمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس میں طے پایا تھا کہ دونوں ملک اپنے اختلافات کو (بشمول جموں وکشمیر) دو طرفہ گفت گو کی بنیاد پر پر امن طریقہ پر حل کریں گے (کلاز ۲)

اس ایگریمنٹ کی رو سے پاکستان نہ کشمیر کے مسئلہ پر جنگ چھیڑ سکتا تھا اور نہ ہندستان کے خلاف وہ گوریلا وار شروع کرا سکتا تھا جو ان کی مدد سے ۱۹۸۹ سے جاری ہے۔ ۱۹۹۲ کے پاکستانی الکشن میں جماعت اسلامی پاکستان نے اس کو اپنا اشو بنایا۔ اس نے کہا کہ شملہ ایگریمنٹ ہمارے لئے کشمیر کے حصول میں رکاوٹ ہے۔ کشمیر جنگ کے بغیر نہیں مل سکتا اور اس ایگریمنٹ نے ہم کو جنگ چھیڑنے سے روک دیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں ووٹ دو تاکہ ہم اس ایگریمنٹ کو ختم کر کے انڈیا سے جنگ کریں اور کشمیر کو دوبارہ حاصل کریں۔ اس زمانہ میں ان کا نعرہ ہوتا تھا:

ٹوٹے شملہ کی زنجیر   لینا ہے اب تو کشمیر

مگر پاکستانی قوم جماعت اسلامی کے اس نعرہ سے متاثر نہیں ہوئی۔ الکشن ہوا تو امیر جماعت قاضی حسین احمد صاحب سمیت جماعت کے تمام لیڈر بری طرح ہار گئے۔

برطانی دور میں شملہ گرمی کے لئے ملک کی راجدھانی سمجھا جاتا تھا۔ آزادی ہند کی بہت سی گفت گوئیں شملہ میں ہوئیں۔ شملہ سے بہت سی تاریخی یادیں وابستہ ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے آخر میں شملہ میں ایک کانفرنس ہوئی۔ لارڈ ویول اس وقت برطانیہ کے وائسرائے تھے۔

کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے اونچے لیڈر اس میں شریک ہوئے۔

اس بات چیت میں برطانی حکومت کی طرف سے جو نقشہ پیش کیا گیا، اس میں مسلمانوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو برابر کا تناسب دیا گیا تھا:

The plan provided for equal proportion of Moslems and Caste Hindus in the Viceroy's Council. (p. 114)

مگر مسٹر جناح کے انکار کی وجہ سے یہ منصوبہ منظور نہ ہوسکا۔ کیوں کہ برطانیہ کی پالیسی یہ تھی کہ مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر کوئی منصوبہ نہ طے کرے۔ مسٹر جناح نے ایک اخباری بیان میں کہا:

We could settle the Indian problem in ten minutes, if Mr. Gandhi would say, 'I agree that there should be Pakistan; I agree that one-fourth of India, composed of six provinces — Sind, Baluchistan, the Punjab, the Northwest Frontier Province, Bengal, and Assam — with their present boundaries, constitute the Pakistan State. (p. 413)

شملہ میں ہر طرف نیچے اونچے راستے ہیں۔ اس لئے شہر کے اندر مال برداری کا کام جزئی طور پر سواریوں کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ یہاں بے شمار مزدور ہیں جو ہر وقت یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ ایک عجیب منظر بار بار یہ دکھائی دیا کہ ایک مزدور کوکنگ گیس کے دو بھرے ہوئے سلنڈر اپنی پیٹھ پر باندھے ہوئے ہے، اور جھکی ہوئی حالت میں اس کو لے کر چل رہا ہے۔ اس میں اتنا اور اضافہ کرلیجئے کہ اس قسم کی پرمشقت مزدوری کرنے والے زیادہ تر کشمیری لوگ نظر آئے۔

۱۹۸۹ سے پہلے کشمیر میں سیاحوں کی مسلسل آمد کی وجہ سے کشمیریوں کے لئے روزی کمانا بہت آسان تھا۔ اس کے بعد وہاں سیاحوں کی آمد رک گئی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ کشمیری لوگ مجبور ہیں کہ وہ باہر جاکر سخت محنت کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کریں۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندستان کی مصیبتوں کے اصل ذمہ دار دو ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح، اور جواہر لال نہرو۔ مسٹر جناح کی فرقہ وارانہ سیاست نے ملک کو ہندو مسلم نفرت سے بھر دیا۔ پاکستان کے لوگ کہتے ہیں کہ ہندو ہمارا ازلی دشمن ہے، زیادہ صحیح طور پہ انھیں کہنا چاہئے کہ جناح کی تفریقی سیاست نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ازلی طور پہ ایک دوسرے کا

دشمن بنا دیا۔

اس کے بعد جواہرلال نہرو کی سوشلسٹ اقتصادیات نے ہندستان کو تباہ کر دیا۔ اس نے ملک کو بے شمار نقصانات پہنچائے۔ انھیں میں سے ایک عام نقصان یہ ہے کہ اس اسکیم نے قوم کی قوم کو کاہل (Lethargic) بنا دیا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ پہلے دہلی میں کوکنگ گیس کا یہ حال تھا کہ بار بار ٹیلی فون کرنے کے بعد وہ کئی دن پر آتی تھی۔ اب لبرلائزیشن کے بعد یہ حال ہے کہ ایک ٹیلی فون کیجئے، اور اسی دن گیس کا سلنڈر آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔

۱۹۴۷ کے بعد ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش اور راجستھان کے علاقہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کو دوبارہ اس علاقہ میں جمانے کے لئے سب سے زیادہ جس نے کام کیا وہ بلاشبہ جمعیۃ علماء ہند ہے۔

یہ کام کس طرح انجام دیا گیا، اس کی ایک مثال مولانا ممتاز احمد قاسمی ہیں۔ ۱۹۶۳ میں دارالعلوم سے فراغت کے بعد انھوں نے ارادہ کیا تھا کہ طب کی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ وہ دہلی آکر مولانا محمد میاں صاحب سے ملے۔ وہ چاہتے تھے کہ مولانا محمد میاں ان کے لئے حکیم عبدالحمید صاحب کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیں تاکہ طبیہ کالج میں آسانی سے ان کا داخلہ ہو جائے۔ مولانا محمد میاں نے ان کی بات سننے کے بعد کہا کہ اگر تم میرا مشورہ مانو تو میں تم کو ایک اور زیادہ بہتر کام بتاتا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ دیکھو، یہ ہماچل پردیش کے ایک گاؤں سے خط آیا ہے کہ یہاں ایک عالم بھیجئے۔ میری رائے ہے کہ تم وہاں چلے جاؤ۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی اللہ کے بھروسہ پر روانہ ہو گئے۔ یہ شملہ کے قریب ایک گاؤں تھا۔ وہاں کی مسجد میں آکر وہ مقیم ہو گئے۔ مگر شروع میں یہ حال تھا کہ اتنے مسلمان نہیں ملتے تھے کہ باجماعت نماز قائم ہو سکے۔ ایک روز جمعہ کا دن تھا۔ مسجد میں صرف دو آدمی تھے۔ تیسرے کی تلاش میں وہ باہر نکلے۔ ایک جاہل مسلمان گھاس کا گٹھر باندھ کر کھڑا ہوا تھا۔ مولانا ممتاز صاحب نے اس سے مسجد چلنے کے لئے کہا۔ اس نے کہا کہ تم مولویوں کو اور تو کوئی کام نہیں۔ پھر وہ بولا کہ اگر تم میرا یہ گھاس کا گٹھر اٹھا لو تو میں تمہارے ساتھ مسجد چلنے کے لئے تیار ہوں۔ مولانا ممتاز صاحب نے فوراً دونوں ہاتھوں سے گھاس کا گٹھر اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اب وہ دیہاتی مسلمان مسکرانے

لگا اور مسجد میں آکر نماز میں شریک ہوگیا۔ آج یہ گاؤں کافی ترقی کر چکا ہے۔ اب وہاں نہ صرف مدرسہ اور مسجد آباد ہیں، بلکہ وہاں کے مسلمان تعلیم اور اقتصادیات میں بھی کافی آگے بڑھ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد مولانا ممتاز صاحب شملہ منتقل ہوگئے۔

ہماچل پردیش پہلے پنجاب کا ایک حصہ تھا۔ ۱۹۴۷ میں یہاں جو قتل و خون ہوا اس وقت بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ علاقہ اب ہمیشہ کے لیے ناقابل رہائش ہو چکا ہے۔ مگر آج دوبارہ یہاں مسلمان معتدل حالات میں آباد ہو رہے ہیں۔ ہماچل پردیش اور پنجاب کے ہر حصہ میں مسلمان دوبارہ نظر آنے لگے ہیں۔

پنجاب کے بہت سے مقامات پر مسلمانوں کی جائدادیں اور ان کی مسجدیں دوبارہ ان کو حاصل ہوگئی ہیں۔ اس سلسلہ کی تازہ خبر یہ ہے کہ پنجاب کے شہر مکتسر میں ایک بڑی مسجد تھی جو ۱۹۴۷ کے ہنگامہ میں سکھوں کے قبضہ میں چلی گئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق "بابا ٹھاکر سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے مکتسر کی اس جامع مسجد کو آپسی بھائی چارہ کے فروغ کے لئے مسلمانوں کے حوالے کر دیا ہے۔ وہاں سے سکھوں کے جھنڈے اور شری گورو گرنتھ صاحب کو بھی ہٹا دیا گیا ہے۔ یہ مسجد ۱۹۴۷ کے بعد گوردوارہ کے طور پر استعمال کی جا رہی تھی۔ اور مقامی شری گورو سنگھ سبھا اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ تقریباً ۱۵ سال پہلے سردار کرتار سنگھ بھنڈراں والا نے اس مسجد میں سکھوں کا جھنڈا نصب کیا تھا۔ (اخبار نو، نئی دہلی۔ ۱۵۔۲۱ جولائی ۱۹۹۴)

فساد خواہ کتنا ہی بڑا ہو، بہت جلد اس کی حد آجاتی ہے، اور آخر کار جس چیز کو فتح اور بقا حاصل ہوتی ہے وہ امن ہے۔ فساد ایک وقتی حادثہ ہے اور امن ایک دیرپا حقیقت۔

۴ جولائی کی شام کا وقت ہے۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا ہے۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں ہوں اور شیشہ کے اُس پار دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ قریب میں کچھ درخت کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دور بھورے رنگ کے بادلوں میں ہر چیز ڈوبی ہوئی ہے۔ دیکھنے سے پہلے شملہ ایک پراسرار مقام محسوس ہوتا تھا۔ لیکن دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ بعض ظاہری فرق کے ساتھ وہ بھی دوسرے شہروں کی طرح ایک شہر ہے۔ کسی پہلو سے اگر شملہ زیادہ ہے تو کسی اور پہلو سے وہ کم ہے۔ اسی طرح ہمارے عام شہر اگر کسی سے کم نظر آتے ہیں تو کسی اور پہلو

سے وہ زیادہ دکھائی دیں گے۔

کانفرنس ۵ جولائی ۱۹۹۴ کو راشٹر پتی نواس (وائسریگل لاج) کے ایک ہال میں شروع ہوئی۔ افتتاحی اجلاس میں سب سے پہلے ایک مرد اور ایک عورت نے مل کر گیتا (سنسکرت) کا ایک حصہ ترنم کے ساتھ پڑھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ کسی بھی مذہبی کتاب کی تلاوت میں وہ شان پیدا نہیں ہوتی، جو قرآن کی تلاوت میں پائی جاتی ہے۔ دوسری مذہبی کتابوں اور قرآن کو اگر ایک ساتھ پڑھا جائے تو صرف لفظی تلاوت ہی قرآن کی برتری ثابت کرنے کے لئے کافی ہوجائے گی۔

اس کے بعد مسز سونیا گاندھی نے افتتاحی خطبہ انگریزی میں پڑھا۔ اس کانفرنس میں تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اور اس کی تمام کارروائیاں از اول تا آخر انگریزی میں ہوئیں۔

شملہ کی اس کانفرنس کا افتتاح پرائم منسٹر نرسمہاراؤ کرنے والے تھے۔ مگر وہ کسی وجہ سے نہ آسکے۔ ان کا پیغام مرکزی وزیر ڈاکٹر من موہن سنگھ نے پڑھ کر سنایا۔ ان کے علاوہ مسز سونیا گاندھی، مسٹر نٹور سنگھ اور، ہماچل پردیش کے گورنر اور چیف منسٹر اور بہت سی اعلا شخصیتیں اس میں شریک ہوئیں۔

اس طرح کی مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے بعد میرا احساس یہ ہے کہ ہمارے ملک میں باشندوں کے اعتبار سے دو ملک پائے جاتے ہیں۔ ایک لور انڈیا، اور دوسرے اپر انڈیا۔ لور انڈیا ۹۹ فیصد لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ایک فیصد انگریزی دانوں کی سطح پر ایک اپر انڈیا ہے۔ یہاں ہر چیز بقیہ ملک سے مختلف ہے۔ یہ تقریباً وہی تقسیم ہے جو برطانوی دور میں انگریزوں اور غیر انگریزوں کے درمیان پائی جاتی تھی۔

راشٹر پتی نواس کے بڑے ہال (ball room) کی ۲۵۰ کرسیاں سب کی سب بھری ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگ کناروں پر کھڑے ہوئے تھے۔ ہال میں داخل ہونے کے بعد میں اپنی نشست کی طرف خاموشی سے بڑھ رہا تھا کہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک معمر خاتون نے میرا نام پوچھتے ہوئے کہا:

Sir, due to your impressive personality, I want to know your name.

ہال کے اندر تمام لوگ شاندار کپڑوں میں ملبوس تھے۔ میں اپنے سادہ کپڑے اور لمبی سفید

داڑھی میں ان کو ایک " درویش " دکھائی دیا۔ ہندو قوم فقیروں اور درویشوں کے حلیہ سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ غالباً اسی طرح کے احساسات کے تحت مذکورہ خاتون نے میرے بارہ میں دریافت کیا۔

موجودہ وائسر یگل لاج جون ۱۸۸۸ میں بن کر تیار ہوا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے وہ وائسرائے کی رہائش گاہ تھا۔ آزادی کے بعد اس کا نام راشٹر پتی نواس رکھا گیا اور وہ گرمیوں کے موسم میں ہندستانی صدر کی رہائش گاہ قرار پایا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اکتوبر ۱۹۶۵ میں اس کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز کے حوالے کر دیا، اب اسی ادارہ کے دفاتر اسی عمارت میں قائم ہیں۔ تاہم اب یہ عمارت جگہ جگہ سے خستہ ہوگئی ہے۔ اس کی دیکھ ریکھ (maintenance) کے لئے مرکزی حکومت سالانہ ۲۰ لاکھ روپیہ دیتی ہے۔ مگر وہ ناکافی ہے۔ اور اس کے منتظم مرنیال میری نے حکومت سے دو کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ کا مطالبہ کیا ہے۔



The viceregal lodge in Shimla which now houses the Indian Institute of Advanced Studies

راشٹر پتی نواس (قدیم وائسریگل لاج)، جہاں یہ کانفرنس ہوئی، وہ بہت بڑا ہے اور عالی شان محل کی مانند ہے۔ اس میں تین سو سے زیادہ کمرے ہیں اور کئی بڑے بڑے ہال ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ۔ مسٹر نٹور سنگھ نے اپنی تقریر میں اس بلڈنگ کی تاریخی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ ملک کی تقسیم کا

منصوبہ اسی عمارت کے ایک کمرہ میں مکمل کیا گیا تھا جو ہمارے اس ہال سے زیادہ دور نہیں ہے:

The partition plan (1947) was finalised here in a room not far from this one.

تاہم یہ سوسالہ عمارت اب کافی حد تک قابل مرمت ہو چکی ہے۔ اور عمارت کے ذمہ داروں کے پاس اتنا فنڈ نہیں کہ وہ اس کے شایان شان اس کی مرمت کر سکیں۔

اس کانفرنس کا بنیادی موضوع یہ تھا کہ گڈ سوسائٹی کیسے بنائی جائے۔ ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ گڈ سوسائٹی کے بارہ میں فلسفی کا پرسیپشن ایک ہے، اور کامن مین کا پرسیپشن گڈ سوسائٹی کے بارہ میں دوسرا ہے۔ کیا یہاں اچھے سماج کا کوئی عالمی نظریہ پایا جاتا ہے:

Is there a universal definition of a good society.

اس طرح کے معاملات میں نظریاتی وحدت صرف مقدس کتاب کے ذریعہ لائی جا سکتی ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے مباحثہ کے ذریعہ ایسے معاملات میں نظریاتی وحدت حاصل کرنا ممکن نہیں۔

مرکزی وزیر ڈاکٹر من موہن سنگھ نے حکومت کی جدید اقتصادی پالیسی (لبرلائزیشن) پر تقریر کی۔ تقریر کے بعد لوگوں نے ان پر سوالات کی بوچھار کر دی خاص طور پر خواتین نے۔ کیونکہ باروزگار خواتین زیادہ تر پبلک سکٹر میں ہیں اور پبلک سکٹر کے ختم ہونے سے عورتوں کے لئے روزگار کے مواقع بہت کم ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر من موہن سنگھ (وزیر مالیات) نے نہایت جرأت کے ساتھ سوالات کا سامنا کیا۔ ایک صاحب سے میں نے کہا کہ من موہن سنگھ کی ایک صفت میں نے یہ دیکھی کہ انھوں نے کسی سوال کا جواب ٹالنے والے (evasive) انداز میں نہیں دیا۔ انھوں نے کہا: جو آدمی ڈبل ٹاک نہیں کرتا وہ کبھی ٹالنے والا جواب (evasive reply) نہیں دے گا۔

ڈاکٹر من موہن سنگھ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم باہر پیسہ لانے کے لئے گئے تو ایک افسر نے ہم کو جواب دیا کہ ہز اکسیلنسی آپ کے ملک سے جتنا پیسہ باہر جا رہا ہے اس کو ملک میں روک لیجئے۔ پھر باہر سے آپ کو پیسہ مانگنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

میں نے ڈاکٹر من موہن سنگھ سے کہا کہ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ پہلے شخص

ہیں جو میرے خواب کو پورا کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ میں جب جواہر لال نہرو نے سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی کا نعرہ دیا اس وقت سے میں اس کا مخالف رہا ہوں۔ میرے نزدیک ہندستان کے تمام اقتصادی مسائل کا سبب یہی ہے۔ آپ بہادرانہ طور پر اس کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ جو لوگ آپ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ سب سطحی سوچ کا شکار ہیں۔ آپ اس مہم کو جاری رکھئے۔ مستقبل میں لوگوں کی سمجھ میں آجائے گا کہ سوشلسٹ پالیسی کے مقابلہ میں لبرل پالیسی ہی زیادہ درست تھی۔

ہماچل پردیش کے چیف منسٹر راجہ ویر بھدر اسنگھ نے اپنی تقریر میں ایک ہندو دعا کا ذکر کیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ انھوں نے اس طرح سنایا:

Lead us from untruth to truth
Lead us from darkness to light.
Lead us from death to immortality.

ہم کو غیر سچائی سے نکال کر سچائی کا راستہ دکھا۔ ہم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آ۔ ہم کو موت سے نکال کر ابدیت میں لے آ۔

اس دعا کا آخری حصہ کس قدر مبہم ہے۔ موت خاتمۂ حیات نہیں، وہ بجائے خود ابدی زندگی کا آغاز ہے۔ موت اگلے مرحلۂ حیات میں داخلہ کا دروازہ ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ پولٹیکل سسٹم اور پولٹیکل کلچر کے درمیان بہت فرق ہے۔ ہمارے یہاں کہنے کے لئے ڈیموکریسی ہے۔ مگر ڈیموکریسی کی اسپرٹ ہمارے یہاں موجود نہیں۔ راستہ روکو، ریل روکو، یہ ڈیموکریسی ہوسکتی ہے۔ مگر یہ ڈیموکریٹک کلچر نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ ڈیموکریسی کے ساتھ ڈیموکریسی کی روایات بھی ضروری ہیں۔ ہمارے یہاں ڈیموکریسی تو آگئی۔ لیکن ڈیموکریسی کی روایات قائم نہیں ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں ڈیموکریسی عملاً انارکی بن کر رہ گئی ہے۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ مغربی طرز فکر آج بھی ہمارے سماج پر غلبہ حاصل کئے ہوئے ہے:

Western framework of thinking is dominating our society

ٹھیک اسی قسم کی باتیں پاکستان کا روایت پسند طبقہ بھی پاکستان میں دہرا رہا ہے۔ دونوں نے اولاً مغرب کو برا بتا کر اس کے سیاسی غلبہ سے نجات حاصل کی۔ مگر اس کے بعد صرف یہ ہوا کہ دونوں ہی نے دوبارہ مغرب کے تہذیبی غلبہ کو مزید شدت کے ساتھ قبول کرلیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مذہب کی ترقی رک جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ مذہب میں سوال یا شبہ کو امر ممنوع سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ شبہ ثبوت کا آغاز ہے:

Doubt is the beginning of proof.

میں نے کہا کہ آپ اگر مذہب کے بجائے اہل مذہب کا لفظ بولیں تو مجھے اس سے اتفاق ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، وہ تو غور وفکر اور تحقیق کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اسی بنا پر دور اول میں مسلمانوں نے علم وتحقیق کے میدان میں غیر معمولی ترقیاں کیں۔ مگر مسلمانوں کی موجودہ نسلوں میں فکری زوال کی بنا پر ضرور ایسا ہے کہ وہ سوال اور تنقید سے بھڑکتے ہیں۔ اور اس کی قیمت انھیں اس صورت میں مل رہی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان علم وفکر کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے ہوگئے ہیں۔

ایک ہندو جرنلسٹ سے موجودہ جرنلزم پر گفتگو ہوئی۔ میں نے ہندستانی جرنلزم کی سطحیت کی شکایت کی۔ انھوں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اصل یہ ہے کہ ہمارے قومی مزاج سے آجکل محنت نکل گئی ہے۔ اس کا اثر جرنلزم پر بھی پڑا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آجکل تحقیقی صحافت (investigative journalism) نام ہے دو رپورٹ پڑھ کر ایک آرٹیکل لکھ دینے کا۔ اور اگر آپ نے تین رپورٹ پڑھ لی تو آپ ایوارڈ کے مستحق بن جائیں گے۔

ایک صاحب کمیونزم سے متاثر تھے۔ ان سے گفتگو ہوئی مگر انھوں نے کمیونسٹ فکر کی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ کمیونسٹ روس کی ناکامی کے بارہ میں انھوں نے کہا کہ کمیونسٹ سسٹم کے ٹوٹنے کو اس معنی میں نہیں لیا جاسکتا کہ تاریخ نے اشتراکی طرز معیشت کو رد کردیا ہے:

The collapse of communism should not be regarded as history's rejection of the socialist pattern.

میں نے کہا کہ یہ دلیل صحیح نہیں۔ میں نے کہا کہ ایک شخص اگر یہ کہے کہ لوگوں کے اندر خوف خدا

آجائے تو سماجی برائیاں مٹ جائیں گی تو اس نظریہ کی صحت کو اس سے جانچا جائے گا کہ خوف خدا آنے کے بعد سماجی برائی مٹی یا نہیں۔ مگر اشتراکیت کی بنیاد فکری تبدیلی پر نہیں ہے بلکہ پیداوار اور تقسیم کے خارجی نظام کی تبدیلی میں ہے۔ اس لئے اگر خارجی نظام بدلنے کے باوجود سماجی برائیاں نہ مٹیں تو اس سے اشتراکی نظریہ رد ہو جائے گا۔ اول الذکر کو جانچنے کا معیار فکری تبدیلی ہے اور ثانی الذکر کو جانچنے کا معیار خارجی ڈھانچہ کی تبدیلی۔ چوں کہ سوویت یونین میں خارجی ڈھانچہ کی تبدیلی کے باوجود سماجی برائیاں ختم نہیں ہوئیں، اس لئے سوویت یونین کی ناکامی خود اشتراکیت کی ناکامی کے ہم معنی قرار پائے گی۔

ایک صاحب نے مہاتما گاندھی کا یہ قول دہرایا کہ دنیا میں آدمی کی ضرورت کے لئے بہت کچھ ہے۔ مگر آدمی کی حرص کے لئے بہت زیادہ نہیں:

There was enough in the world for every ones's need but not for everyone's greed.

یہ بات بالکل درست ہے۔ موجودہ دنیا آزمائش کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس لئے یہاں اتنا ہی سامان رکھا گیا ہے جو آزمائش کے لئے ضروری ہو۔ انسان کی خواہشات کی لامحدود تکمیل کے لئے آخرت کی دنیا ہے۔ جو لوگ موجودہ دنیا میں اپنی آزمائش میں پورے اتریں گے وہ آخرت میں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے لامحدود سامان پالیں گے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اب دنیا بہت بدل چکی ہے۔ بیسویں صدی کے آخر میں خوش قسمتی سے امپیریلزم اور نسل پرستی انسانیت کے ایجنڈے پر نہیں ہیں۔ اب ایک نئے ورلڈ کی باتیں ہر طرف کی جارہی ہیں:

Colonialism, imperialism and racialism are fortunately no longer on the agenda of humankind. There is much talk of a new world order.

یہ بات درست ہے کہ مختلف تجربات کے بعد اب انسانی ذہن کسی نئی چیز کی تلاش میں ہے۔ یہ نئی چیز مذہب کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ سیکولر نظریات سب کے سب ناکام ہو چکے ہیں۔ اس نے دین حق کے لئے دوبارہ نئے مواقع دے دئے ہیں۔ مگر دین حق کو نئی دنیا میں عظمت کا مقام

دینا "گن کلچر" کے ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف دلیل کے زور پر ہی ہوسکتا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ دین حق کو جدید انسان کے فکری مستوی پر پیش کیا جائے۔ اگر ایسا ہوسکے تو دین حق کو دوبارہ تاریخ میں واپسی سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

دسمبر ۱۹۹۰ میں جے پور میں بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) کا ایک اجلاس ہوا۔ وہاں کچھ ہندوؤں نے یہ نعرہ لگایا: جو ہندو ہت میں بات کرے گا، وہی دیش پر راج کرے گا۔

کچھ اور ہندوؤں کو یہ نعرہ پسند نہیں آیا۔ انھوں نے اس کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ حتی کہ اگلے دن اجلاس ہوا تو انھوں نے نعرہ لگایا: جو راشٹر ہت میں بات کرے گا، وہی دیش پر راج کرے گا۔ (ہندستان ٹائمس، سنڈے اڈیشن، صفحہ ۲)

یہ واقعہ علامتی طور پر اس صورتحال کو بتا رہا ہے جو اس وقت ہندو قوم کے اندر موجود ہے۔ ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کی نمائندگی اول الذکر نعرہ میں ہو رہی ہے، اور دوسرے وہ جن کی نمائندگی ثانی الذکر نعرہ میں پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اسی کو قرآن میں قانون دفع کہا گیا ہے (البقرہ ۲۵۱، الحج ۴۰) یہ فطرت کا نظام ہے کہ وہ ایک کو دوسرے کے ذریعہ دفع کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی مفسد یا انتہا پسند کبھی زیادہ تک یا بہت دور تک اپنا کام نہیں کر پاتا۔ جب بھی کوئی شخص یا گروہ ایسا اٹھتا ہے تو فطرت کی طاقتیں اس کا مقابلہ کر کے اس کو پیچھے دھکیل دیتی ہیں۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے سیمناروں کے بارہ میں میری رائے زیادہ اچھی نہیں۔ یہاں بھی میں نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا۔ میرا تجربہ ہے کہ یہ لوگ زیادہ تر خوبصورت الفاظ کے فرضی قلعے بناتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ذاتی زندگی میں آخری حد تک پریکٹیکل ہوتے ہیں۔ مگر سیمنار میں آتے ہی وہ آئیڈیلسٹ بن جاتے ہیں۔ اسی لئے ان کی باتیں خوبصورت الفاظ بکھیرنے کے سوا کوئی اور نتیجہ ظاہر نہیں کر پاتے۔ خوبصورت الفاظ سے میری مراد کیا ہے، اس کی ایک مثال لیجئے۔ ایک صاحب نے اپنی تقریر میں انڈیا کی اقتصادیات پر بولتے ہوئے کہا:

We have to see that the economy becomes sound and we are able to integrate with the global economy.

بظاہر یہ الفاظ بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان الفاظ کے اندر کسی بھی درجہ میں کوئی عملی رہنمائی موجود نہیں۔ اور نہ اس طرح کے الفاظ سے ملک کا کوئی اقتصادی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

ایک دانشور نے کہا کہ آپ کو اپنے سماجی حالات کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنا ہوگا:

You will have to combine your social conditions to the modern technology.

یہ بھی اسی قسم کا ایک خوبصورت جملہ ہے۔ وہ سننے میں تو اچھا لگتا ہے مگر اس کے اندر ہمارے لئے کوئی عملی رہنمائی موجود نہیں۔

یہاں جن لوگوں نے تقریریں کیں، ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا انداز تھا۔ مگر مجھے سب سے زیادہ شری ارجن سنگھ (مرکزی وزیر) کا انداز پسند آیا۔ ان کے ہاتھ میں چند ٹائپ شدہ اوراق تھے۔ انھوں نے اس کو پڑھا نہیں۔ بس درمیان تقریر میں کبھی کبھی وہ اس یادداشت پر ایک نظر ڈال لیتے تھے، اور پھر برجستہ انداز میں اظہار خیال کرتے تھے۔ ان کے بولنے کا طریقہ یہ تھا کہ ٹھہر ٹھہر کر سنجیدہ لہجہ میں اپنے خیالات پیش کرتے تھے۔ نہ کبھی زور سے بولے اور نہ کبھی جوش دکھایا۔ شروع سے آخر تک یکساں سلجھا ہوا انداز رہا۔

چائے کا وقفہ ہے۔ لوگ ایک ہال کے اندر جمع ہیں۔ میں ایک کنارے کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں۔ لوگ خوش ہیں۔ وہ شوق سے کھا پی رہے ہیں اور آپس میں تفریحی باتیں کر رہے ہیں۔ مگر میں ان کے ساتھ شریک نہیں۔ غمگین دل کے ساتھ میری زبان سے نکلا: آہ، کس طرح لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ "چند دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات" کا معاملہ ہے۔ ان لوگوں کو حقیقت سے باخبر کرنے کی صورت صرف یہ تھی کہ مسلمان صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے داعیانہ کردار پر قائم رہتے وہ ہر قیمت پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نارمل تعلقات کو باقی رکھتے۔ وہ نفرت اور کشیدگی اور ضد کو ختم کر دیتے، خواہ اس کے لئے کوئی بھی قربانی دینی پڑے۔ اگر ایسا ہوتا تو دونوں فرقوں کے درمیان معتدل حالات میں انٹرایکشن ہوتا۔ اس کے درمیان بالکل فطری طور پر علم حقیقت لوگوں تک پہنچتا رہتا۔ اس کوتاہی کے ساتھ اگر مسلمانوں کا ایک ایک شخص تہجد گزار ہو جائے تب بھی اللہ کے یہاں وہ بری الذمہ ہونے والے نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے پرفخر انداز میں کہا کہ سیمیٹک مذاہب میں یہ عقیدہ ہے کہ سچائی ایک

ہے۔ مگر ہندوازم میں اس قسم کا ریجڈ نظریہ نہیں۔ ہندوازم میں مانا گیا ہے کہ حقیقت کے مختلف روپ ہو سکتے ہیں۔ سبھی مذاہب اپنی اپنی جگہ پر سچے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ بات کہنے میں تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ گہرائی کے ساتھ سوچیں تو آپ کو اس میں کئی خلا نظر آئے گا۔ مثلاً اس تصور میں اخلاق و ویلوز سب کی سب اضافی (relative) قرار پاتی ہیں۔ جب دو مختلف اخلاقی رویہ کو بیک وقت درست سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد ایک اخلاقی معیار اور دوسرے اخلاقی معیار میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں پائے جانے والے موجودہ غیر معمولی کرپشن کی۔

۶ جولائی کو میری صدارت میں جو اجلاس ہوا۔ اس میں لیڈ اسپیکر ڈاکٹر پی آر چاری (آئی اے ایس) تھے۔ پہلے میں نے مختصر طور پر تعارفی تقریر کی۔ اس کے بعد مسٹر چاری نے اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد جن افراد نے بحث میں حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں —— مسٹر رائنا، ڈاکٹر چھوٹانی، ڈاکٹر برار، پروفیسر پی این دھر، پروفیسر رویندر کمار، پروفیسر رندھاوا، پروفیسر ستپال، پروفیسر راؤ، مسٹر نلنی سنگھ، ڈاکٹر کرن بیدی، مسٹر نٹور سنگھ، مسٹر سریندر ناتھ۔ آخر میں میں نے مفصل طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بتایا کہ پر امن سماج بنانے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔

مسٹر پی ایس چاری (آئی اے ایس) نے اپنی تقریر میں بتایا کہ پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷) کے بعد جب بنگال اور اس کے آس پاس کے علاقہ پر انگریزوں کا سیاسی قبضہ ہو گیا تو ہیسٹنگز (Warren Hastings) کو اس کا پہلا گورنر جنرل بنایا گیا۔ ۱۷۷۸ تک وہ یہاں کا گورنر جنرل رہا۔ اس وقت یہاں کوئی انتظامی ڈھانچہ نہیں تھا۔ دیہاتوں میں زمیندار بے زمین لوگوں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ ہیسٹنگز نے بنگال کو انتظامی یونٹوں میں تقسیم کیا اور ہر یونٹ کے لئے ایک انگریز کلکٹر بھیجا۔ ان انگریزوں کو اس نے کوئی تفصیلی قانون یا قاعدے نہیں بتائے۔ ان کو صرف ایک بنیادی ہدایت دیدی —— تم ظالموں اور کسانوں کے درمیان کھڑے ہو جاؤ:

Thou shalt stand between the hand of oppression and the peasantry.

یہی سماجی انتظام کا خلاصہ ہے۔ سماجی حالات کو درست کرنے کے لئے ایک ہی کام کرنا ہے۔ مظلوموں کے خلاف ظالموں کا ہاتھ پکڑ لینا۔ اگر یہ چیز حاصل ہو جائے تو بقیہ حالات خود فطرت کے

زور پر درست ہو جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ میں مکہ میں جو حلف الفضول ہوا، اس کی روح بھی یہی تھی۔

میں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ پیشگی طور پر تین صفحہ میں لکھ لیا تھا۔ اس کی کاپیاں منتظمین کی طرف سے کانفرنس میں تقسیم کی گئیں۔ یہ مقالہ ان شاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ لوگوں کا تاثر بہت اچھا تھا۔ مسز انجنا سانیال نے کہا: آپ کا پیپر میں نے پڑھا۔ اور اس کی کاپی بھی اپنے پاس رکھ لی۔ وہ بہت سرل ہے اور فوراً سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسی طرح کا تاثر جسٹس پاٹھک نے بھی بیان کیا۔

ڈاکٹر کرن بیدی بھی اس کانفرنس میں شریک تھیں۔ وہ انسپکٹر جنرل آف پولیس (آئی جی) ہیں۔ اور اس وقت دہلی جیل (پریزن) کی انچارج ہیں۔ کانفرنس کے بعد ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ میں آپ کے مضامین ہندی اور انگریزی اخباروں میں پڑھتی رہتی ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ جیل میں ہم آپ کے لکچر کا انتظام کریں۔ آپ وہاں آئیں اور ہمارے قیدیوں کے سامنے اسلام کی روشنی میں اخلاق اور انسانیت والی باتیں بتائیں۔

انھوں نے بتایا کہ میری ماتحتی میں اس وقت نو ہزار قیدی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جیل کا ہر آدمی دھرم میں بشواس رکھتا ہے، اور اگر پہلے وہ ایسا نہیں تھا تو اب وہ ایسا ہو گیا ہے۔ جب میں پولیس افسر بنی تو میرے اندر روحانیت (spirituality) نہیں تھی۔ مگر جیل والوں کو دیکھ کر مجھے بھی دھرم اور روحانیت کے بارہ میں پڑھنا پڑا تاکہ میں ان کو بتا سکوں۔ انھوں نے ہر روز ایک گھنٹہ کے لئے جیل میں سرو دھرم سبھا شروع کر دیا۔ کیوں کہ جیل میں ہر مذہب کے لوگ موجود تھے۔ ان تجربات نے خود ان کے اندر بھی روحانیت پیدا کر دی۔

شملہ سے واپسی کے بعد ۱۰ جولائی کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کرن بیدی کو مشہور میگ سیسے ایوارڈ (Magsaysay Award) دیا گیا ہے جو ۵۰ ہزار ڈالر پر مشتمل ہے۔ یہ ایک انٹرنیشنل ایوارڈ ہے۔ جب ان کو اس ایوارڈ کی خبر ملی تو وہ ناچ اٹھیں۔ انھوں نے کہا:

I am thrilled. It's God's grace.

ڈاکٹر کرن بیدی ایک بہادر اور دیانت دار خاتون ہیں۔ اخبار پڑھنے والے جانتے ہیں کہ

پچھلے دنوں انھیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر انٹرنیشنل سطح پر اعتراف کے بعد اب ان کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ مشہور مثل ان کے اوپر صادق آئی کہ آدمی پہلے باہر پہچانا جاتا ہے، اس کے بعد اندر کے لوگ اس کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ پہلی بار ٹائمس آف انڈیا (۲۰ جولائی ۱۹۹۴) میں ان کے بارہ میں مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے:

Kiran Bedi as the ideal police officer.

مسز نلنی سنگھ ٹی وی کی دنیا میں کافی مشہور ہیں۔ وہ اپنے کیریر میں نہایت کامیاب سمجھی جاتی ہیں۔ ایک عام آدمی ان کو کامیاب خاتون سمجھے گا۔ مگر ایک ملاقات میں انھوں نے نہایت افسردگی کے ساتھ اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ زندگی صرف پیسہ اور شہرت کا نام تو نہیں۔ میں جب زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچتی ہوں تو مجھے یہ ساری سرگرمیاں بے کار (futile) نظر آنے لگتی ہیں۔ مجھ کو جینے کے لئے بظاہر سب کچھ ملا ہوا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جیو تو کس کے لئے جیو۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے ساتھ جب تک آخرت کو نہ جوڑا جائے، زندگی کی معنویت سمجھ میں نہیں آتی۔ کچھ سطحی قسم کے لوگ اس کے بغیر خوش رہ سکتے ہیں مگر ایک سنجیدہ آدمی کبھی اس پر مطمئن نہیں ہوسکتا کہ زندگی بس اتنی ہے کہ ــــ پیدا ہو، کھاؤ پیو اور مرجاؤ۔

ڈاکٹر محمود صاحب اور اقبال احمد صاحب عرصہ سے شملہ میں رہتے ہیں۔ ۴ جولائی کی رات کو ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ شملہ میں تقریباً تین ہزار مسلمان ہیں جن میں زیادہ تر لیبر کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں سات مسجدیں اور ایک مدرسہ بھی قائم ہے۔ ۱۹۴۷ تک شملہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں کی زمینیں زیادہ تر مسلمانوں کے پاس تھیں۔ مگر تقسیم کے بعد جب پنجاب میں مارکاٹ ہونے لگی تو یہاں کے مسلمان گھبرا کر یہاں سے بھاگ گئے۔ اس کے بعد پھر یہاں مسلمان دوبارہ جم نہ سکے۔

تقسیم کے نتیجہ میں جو بربادیاں پیدا ہوئیں ان کی گنتی کرنا مشکل ہے۔ تاہم سب سے بڑی برائی جو تقسیم نے پیدا کی ہے وہ نفرت ہے۔ تقسیم کی تحریک بظاہر اسلام کے نام پر اٹھائی گئی۔ مگر حقیقۃً یہ نفرت کا ایک ہنگامہ تھا۔ اولاً اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل نفرت پیدا کی۔ اور اس کے بعد خود مسلمانوں اور مسلمانوں میں گہری نفرتیں جگا دیں۔ چنانچہ پاکستان

میں باہمی نفرت اور تشدد جتنا زیادہ پایا جاتا ہے اتنا کسی بھی دوسرے مسلم ملک میں نہیں۔ اسی بنا پر مسٹر مجید نظامی نے پاکستان کو ناپاکستان کہا ہے (نوائے وقت)

مجھ سے کہا گیا تھا کہ آپ ہوٹل کی روم سروس کو ٹیلی فون کرکے اپنا ناشتہ اور کھانا اپنے کمرہ میں منگالیا کریں۔ مگر میں قصداً ڈائننگ ہال میں جاکر کھاتا تھا۔ کیوں کہ اس طرح لوگوں کا مطالعہ کرنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملتا ہے۔

جب میں لوگوں کو جوش اور انہماک کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اکثر میں سوچنے لگتا ہوں کہ یہ لوگ آخر کیا باتیں کرتے ہیں۔ کیوں کہ میرے نزدیک تو یہ دنیا چپ ہو جانے کی جگہ ہے نہ کہ بولنے کی جگہ۔ اس دنیا کی ہر چیز آدمی سے کہہ رہی ہے کہ خدا کی عظمتوں کو پہچانو، اپنا احتساب کرو، اپنے حال پر غور کرکے اپنے مستقبل کا خاکہ بناؤ۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھیں سوچنے کی فرصت نہیں۔ وہ صرف ایک چیز جانتے ہیں ــــــ بے محابا بولتے رہنا۔

۵ جولائی کی صبح کو ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کچھ لوگ میرے قریب کی لمبی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے دوسرے سے کہا: "۲۵ نکال دو، پھر دیکھو کہ کتنا بچا"۔ دوسرے نے کہا: دیکھو ان گدھوں کو، میرا پرموشن چار سال سے روک رکھا ہے۔ تیسرے نے کہا: اجی سروس میں کیا رکھا ہے، فلاں کو دیکھو۔ چند سال پہلے ٹھیکہ داری شروع کی تھی۔ آج ماروتی کار میں گھوم رہا ہے۔

یہی حال ۹۹ فیصد لوگوں کا ہے۔ سنجیدگی اور گہرائی آج لوگوں سے اٹھ گئی ہے۔ سطحی باتوں کے سوا کسی اور چیز سے لوگوں کو دلچسپی نہیں۔

مسز اجنتا سانیال منتظمین کی ٹیم سے تعلق رکھتی تھیں۔ شملہ کے راستہ میں مجھ کو چکر آگیا، اور وہاں قیام کے دوران بھی چکر آتا رہا۔ موصوفہ نے میرے علاج اور آرام کا ہر طرح اہتمام کیا۔ وہ برابر میری خبرگیری کرتی رہتی تھیں۔ راشٹر پتی نواس میں ایک کمرہ انھوں نے میرے لئے خاص کرا دیا تھا کہ میں اس میں آرام کروں اور جب جی چاہے، کانفرنس میں آجاؤں۔

میں نے موصوفہ کا شکر ادا کیا تو انھوں نے کہا: مجھ کو تو بس آپ آشیرواد دیجئے کہ میں بھی چل سکوں سچائی پر جیسے کہ آپ چل رہے ہیں سچائی پر۔

شملہ کانفرنس کی میزبانی ہماچل پردیش سرکار نے اپنے ذمہ لی تھی۔ چنانچہ ہماچل پردیش کے گورنر اور چیف منسٹر اور دوسرے سرکاری افراد برابر اس کانفرنس میں ذاتی طور پر شریک رہے۔

ہماچل پردیش (نیز پنجاب اور چنڈی گڑھ) کے گورنر مسٹر سریندر ناتھ کی کرسی میری کرسی سے ملی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان سے کافی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ گورنری کی میعاد پوری ہونے کے بعد وہ مذہبیات پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام پر کئی کتابوں کے نام مجھ سے پوچھ کر نوٹ کئے۔ ۷ جولائی کی شام کو انھوں نے گورنر ہاؤس میں نہایت اہتمام کے ساتھ تمام شرکاء کانفرنس کو ڈنر دیا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے تمام افراد خاندان کا مجھ سے تعارف کرایا۔ سب کے سب بہت خوش نظر آتے تھے۔

عجیب بات ہے کہ جب میں کانفرنس سے فارغ ہو کر دہلی واپس آیا تو یہاں خبر ملی کہ ۹ جولائی کی صبح کو ان کے تمام افراد خاندان (گورنر صاحب کو لے کر دس افراد) ہوائی جہاز کے حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ موصوف اپنی بیوی، لڑکی اور داماد، ان کے دو لڑکے، ایک بیٹا اور اس کی بیوی، اور ان کی دو لڑکی کے ساتھ شملہ سے چنڈی گڑھ جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کا چھوٹا جہاز پہاڑی سے ٹکرا گیا اور جہاز کے عملہ سمیت تمام کے تمام مسافر ہلاک ہو گئے۔ اس واقعہ کی خبر پاکستانی اخبار (نوائے وقت ۱۰ جولائی ۱۹۹۴) میں اس سرخی کے ساتھ چھپی: بھارتی پنجاب کا ہندو گورنر خاندان سمیت طیارے کے حادثہ میں مارا گیا۔

پہاڑوں کے اوپر اس وقت گہرا کہر تھا۔ غالباً دھند (Poor Visibility) کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا۔ جس سرکاری جہاز پر یہ لوگ سفر کر رہے تھے اس کا نام سپر کنگ (super king) تھا۔ مگر فطرت کے مقابلہ میں نہ کوئی سپر ہے اور نہ کوئی کنگ۔

وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے سامنے کانگرس پارٹی کے ایک شخص نے کہا کہ نرسمہا راؤ کو ابھی دس سال اور پرائم منسٹر کے عہدہ پر رہنا چاہئے۔ نرسمہا راؤ نے فوراً جواب دیا کہ یہ بہت بڑی بھول ہے کہ کسی کے لئے دس سال یا بیس سال کی اصطلاح میں سوچا جائے۔ دیکھئے پنجاب کے گورنر سریندر ناتھ کے ساتھ کیا ہوا:

It is a big mistake to think in terms of 10 or 20 years. See what happened to the Punjab governor Surrendra Nath.

شریمتی گایتری رے (Gayatri Ray) اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ میں اسسٹنٹ سکریٹری ہیں۔ وہی اس کانفرنس کی آرگنائزر تھیں۔ جب میں شملہ پہنچا تو وہ بار بار مجھ سے کہتی تھیں کہ یہاں جو لوگ جمع ہوئے ہیں وہ سب آپ کو خصوصی طور پر سننا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ خوب کھل کر اپنے خیالات رکھیں۔ ۶ جولائی کی شام کو مجھے اس کا موقع ملا۔ میں نے تفصیل کے ساتھ موضوع پر روشنی ڈالی۔ موضوع تھا: پرامن دنیا کی طرف (Towards a non-violent world)

شریمتی گایتری رے نے اپنا ایک عجیب قصہ سنایا۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۷۱ میں جب بنگلہ دیش کی جنگ ہوئی، اس وقت ان کے شوہر ہندستانی سفیر کی حیثیت سے ڈھاکہ میں مقیم تھے۔ پاکستانی فوج نے ان کو ہاؤس ارسٹ (خانہ قید) کر دیا۔ اتفاق سے انھیں دنوں وہ حاملہ تھیں۔ ڈاکٹری حساب کے مطابق، ۱۸ ستمبر کو ان کے یہاں ڈیلوری ہونے والی تھی۔ وہ بہت پریشان ہوئیں۔ انھوں نے پاکستانی حکام تک اپنی فریاد پہنچائی۔ مگر انھوں نے گھر سے نکل کر اسپتال جانے کی اجازت نہیں دی۔ البتہ ایک پاکستانی ڈاکٹر کو ان کی مدد کے لئے گھر پر بھیجا۔ لیکن انھوں نے پاکستانی ڈاکٹر کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔

انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے کمرہ میں بیٹھ کر بھگوان سے خوب پرارتھنا کی کہ وہ ان کی ڈیلوری کو روک دے۔ ان کی دعا قبول ہوئی۔ اور ڈیلوری کی تاریخ ایک مہینہ کے لئے مؤخر ہوگئی۔ چنانچہ ان کی دہلی واپسی کے بعد ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۱ کو ان کے یہاں بچہ پیدا ہوا۔

میڈیکل تحقیق کے مطابق، بچہ کی پیدائش ۲۸۰ دن میں ہو جانا ضروری ہے۔ مگر دعا نے اس کو ایک مہینہ تک کے لئے روک دیا۔ شاید یہی مطلب ہے اس حدیث کا کہ: لَا یَرُدُّ القَدَرَ إِلَّا الدُّعَاءُ (احمد)

یہاں جو وی آئی پی تھے وہ سب مجھ کو پہلے سے جانتے تھے۔ وہ اخباروں میں میرے مضامین پڑھے ہوئے تھے۔ ہر ایک بڑے شوق سے ملا۔ ہماچل پردیش کے گورنر مسٹر سریندر ناتھ نے کہا کہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد میں مذہب پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمام مذہبوں کی تعلیمات بنیادی طور پر ایک ہیں۔ میں اس کے بارہ میں مزید تفصیلی اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اس موضوع کی کتابیں بتائیے۔ میں نے کہا کہ اس موضوع پر مسلمانوں نے بہت کم

کتابیں لکھی ہیں۔ میں نے کئی انگریزی اور اردو کتابوں کے نام انھیں نوٹ کرائے۔

میں نے کہا کہ مسلم علماء اس نظریہ سے زیادہ اتفاق نہیں کرتے۔ البتہ غیر مسلم حضرات کو اس سے کافی دل چسپی ہے اور انھوں نے اس پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

رشید طالب صاحب ایک کافی تجربہ کار صحافی ہیں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے کہا کہ اوسط قاری کی پسند یا ناپسند اس اعتبار سے ہوتی ہے کہ کالم نگار اس کے اپنے خیالات کی تائید کرتا ہے یا تائید نہیں کرتا۔

The average reader approves or disapproves of a columnist depending on how far the columnist rationalises the reader's prejudices.

یہ صرف اخبار کے قاری کی بات نہیں ہے۔ یہی بیشتر انسانوں کی بات ہے۔ بیشتر لوگ صرف وہی باتیں سننا پسند کرتے ہیں جو ان کے مخصوص فکر کی تصدیق کرنے والی ہوں۔ اگرچہ اس مزاج کی یہ بھاری قیمت انھیں دینا پڑتا ہے کہ ان کا فکری ارتقاء رک جاتا ہے۔

مسٹر رشید طالب ایک لبرل مسلمان ہیں۔ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ اس کانفرنس میں شریک تھے۔ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ اسلام میں نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ اس کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق کیا جاسکے۔ انھوں نے تسلیمہ نسرین کے خلاف قتل کے فتوے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بددین کے خلاف اسلام کی مقرر کی ہوئی سزا کیا جدید معیار انصاف کے مطابق ہے:

Is the Islamic punishment for apostasy fair by modern standards of justice?

میں نے کہا کہ یہ بات آپ اس مفروضہ پر کر رہے ہیں کہ تسلیمہ نسرین کے قتل پر جو لوگ انعام کا اعلان کر رہے ہیں وہ اسلام کے نمائندہ ہیں۔ حالاں کہ وہ ہرگز اسلام کے نمائندہ نہیں۔ یہ تو کچھ بے علم لوگوں کا شور وغل ہے۔ اس سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ قرآن پڑھیں تو آپ پائیں گے کہ مخالفوں کی اس قسم کی باتوں کا جواب دلیل سے دیا جارہا ہے۔ یہی اسلام کا طریقہ ہے۔ پھر وہ کون سا جدید معیار ہے جس سے اسلام ٹکرا رہا ہے۔

۶ جولائی ۱۹۹۴ کو مسجد بابو گنج دیکھی۔ ۱۹۴۷ میں یہ مسجد نامکمل حالت میں تھی۔ تقسیم کے ہنگامہ میں یہاں کے مسلمان اس علاقہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس لئے مسجد بھی نامکمل حالت میں پڑی رہی۔ حالات

نارمل ہونے کے بعد دوبارہ مسلمان یہاں آنا شروع ہوئے۔ اب یہ مسجد آباد ہے اور تعمیری اعتبار سے مکمل ہو چکی ہے۔ اس کے اطراف میں مسلمانوں کے پانچ گھر ہیں۔ مسجد میں ایک مدرسہ ہے اور مختلف شعبے قائم ہیں۔ وہ ہماچل پردیش کے لئے اسلامی مرکز کا کام کر رہی ہے۔

اس دنیا میں وقتی نقصان ہر ایک کو پیش آتا ہے۔ مگر یہ قدرت کا قانون ہے کہ وقتی نقصان ہمیشہ وقتی نقصان رہے، وہ کسی کے لئے مستقل بربادی نہ بنے۔

بابو گنج کی مسجد کے پاس ایک صاحب پنڈت دیا رام رہتے ہیں۔ یہاں کے مندر کا انتظام بھی وہی کرتے ہیں۔ پچھلے رمضان میں ایسا ہوا کہ رات کو جس وقت مسجد میں تراویح ہوتی، عین اسی وقت مندر میں لاؤڈ اسپیکر پر بھجن ہوتا۔ اس سے نمازیوں کو الجھن پیش آرہی تھی۔ آخر ایک روز ایک مسلمان نے پنڈت جی سے اس کا ذکر کیا۔ پنڈت جی نے فوراً کہا کہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ انھوں نے اسی دن ہدایت کر دی کہ تراویح کے وقت مندر کا لاؤڈ اسپیکر بند کر دیا جائے اور دوبارہ اس وقت کھولا جائے جب کہ تراویح ختم ہو چکی ہو۔

پنڈت دیا رام مجھ سے ملنے کے لئے مسجد میں آئے۔ ان کی عمر ۷۲ سال ہو چکی ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ نے ۱۹۴۷ سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور ۱۹۴۷ کے بعد کا زمانہ بھی دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے دونوں میں کیا فرق پایا۔

پنڈت جی نے کہا کہ بہت زیادہ فرق ہے۔ اس وقت انسان کی قدر تھی۔ لوگ ایماندار تھے۔ ہم سکون کے ساتھ رہتے تھے۔ لاٹ صاحب (انگریز وائسرائے) سڑک پر صرف ایک گاڑی میں چلتے تھے۔ کل دہلی کے منسٹر صاحب آئے ہیں۔ جب وہ ایئرپورٹ سے یہاں پہنچے تو میں نے ان کے موٹروں کے قافلہ کو گنا تو کل ۲۲ گاڑیاں ان کے ساتھ چل رہی تھیں۔

انھوں نے کہا کہ اب جو اختلاف اور لڑائی جھگڑا ہے وہ سب پالی ٹکس کی وجہ سے ہے۔ "ووٹ کے چکر میں سارے اختلافات پیدا ہو گئے"۔

انھوں نے بتایا کہ یہاں کے سیسل ہوٹل (Cecil Hotel) کا لان اس وقت بہت اچھا ہوا کرتا تھا۔ اس کے گیٹ کے سامنے یہ بورڈ لگا رہتا تھا —— کہ ہندستانی اور کتے اندر داخل نہ ہوں:

اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ کتے کی عادت ہے کہ وہ گھاس کو اپنے پنجہ سے کریدتا ہے۔ اسی طرح بوٹ پہن کر جانے سے لان کی گھاس خراب ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ دونوں کو اندر جانے سے روکتے تھے۔ انگریز جو یہاں آتے تھے، وہ بوٹ پہن کر اس کے اندر نہیں جاتے تھے۔ ان کے پاس فوم جیسا چپل ہوتا تھا۔ وہ لان میں جاتے ہوئے یہی چپل پہن لیتے تھے۔ اس منظر کو پنڈت جی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر جگدیش شرما شملہ ریڈیو کے پروگرام ایگزیکیٹو ہیں۔ وہ ریڈیو کے لئے انٹرویو چاہتے تھے۔ چنانچہ طے ہوا کہ ۷ جولائی کو صبح ساڑھے آٹھ بجے وہ میرے ہوٹل پر آئیں گے۔ مگر مجھ کو بالوگنج کی مسجد میں دیر ہوگئی۔ ہوٹل کے رسپشن میں ٹیلی فون کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ٹھیک وقت پر ہوٹل پہنچ چکے ہیں۔ جب ان کو بتایا گیا کہ اس وقت میں بالوگنج کی مسجد میں ہوں تو انھوں نے کہا کہ کوئی ہرج نہیں۔ میں وہیں آجاتا ہوں۔ چنانچہ وہ ریکارڈنگ کے سامان کے ساتھ مسجد میں آگئے۔ یہاں انھوں نے تفصیلی انٹرویو لیا (Tel. 3471-77301)

میں نے خاص طور پر اس پہلو پر زور دیا کہ سماجی اور قومی زندگی میں امن لانے کے لئے ضروری ہے کہ لوگ تحمل اور رواداری کے ساتھ رہنا سیکھیں۔ تحمل اور رواداری فطرت کا ایک قانون ہے۔ اس کے بغیر ایک پرامن گھر بھی نہیں بنایا جاسکتا، کجا کہ اس کے بغیر کوئی پرامن سماج بنایا جاسکے۔

انگریزی روزنامہ ٹریبون (The Tribune) کے پریس رپورٹر مسٹر ریشں گری نے ۶ جولائی ۱۹۹۴ کی شام کو انٹرویو لیا (Tel. 01886-32088)

ایک سوال یہ تھا کہ شملہ کانفرنس کے بارہ میں آپ کا تاثر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس طرح کی کانفرنس بجائے خود منزل نہیں ہوتی۔ یہ تو راستہ طے کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک مفید کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس میں ٹاپ کے لوگ جمع ہوئے۔ انھوں نے اپنے علم اور تجربہ سے ایک دوسرے کو بہت کچھ دیا۔ خود میں نے یہاں کئی نئی باتیں سیکھیں۔ مجھے امید ہے کہ دو دن کا یہ اجتماع ملک کی تعمیر و ترقی کی طرف ایک مثبت قدم ثابت

ہوسکتا ہے۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی اور گلزار محمد بھارتی (چیئرمین حج کمیٹی، ہماچل پردیش) نے بتایا کہ ۱۹۹۰ میں جب کہ ہماچل پردیش میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت تھی، اس کے کارکنوں نے ریاست میں بہت طوفان مچایا۔ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف جگہ جگہ جلوس نکالے جس میں اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے۔ مثلاً: مندر تو ایک بہانہ ہے، مسلمانوں کو دور بھگانا ہے۔ ہماچل پردیش کی کل آبادی ۵۵ لاکھ ہے۔ اس میں تقریباً دو لاکھ مسلمان ہیں۔ ریاست کے مسلمان سخت گھبرا اٹھے۔ یہاں تک کہ ان کا خیال ہوگیا کہ ریاست کو چھوڑ کر چلے جائیں۔

مولانا ممتاز صاحب اور گلزار محمد صاحب ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۰ کو راجہ ویربھدر اسنگھ سے اُن کی رہائش گاہ (شملہ) پر ملے۔ اب وہ چیف منسٹر ہیں۔ مگر اس وقت وہ صرف ایم ایل اے تھے۔ مولانا ممتاز صاحب نے بتایا کہ جب انھوں نے ہماچل پردیش کے مسلمانوں کی حالت بتائی اور کہا کہ شاید آپ کو وہ دن دیکھنا پڑے کہ ہماچل پردیش میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہے، تو ویربھدر اسنگھ رونے لگے۔ ان کی آواز رندھ گئی۔ انھوں نے کہا کہ تمام مسلمانوں کو شملہ میں میری کوٹھی پر لے آؤ۔ میں یہاں گیٹ پر بندوق لے کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ پہلی گولی میرے سینہ پر لگے گی، اس کے بعد وہ کسی مسلمان تک پہنچے گی۔

راجہ ویربھدر اسنگھ نے اسی وقت خود اپنے ہاتھ سے ایک درخواست ٹائپ کی اور اس کو لے کر گورنر ہماچل پردیش کے یہاں پہنچے۔ ان کی باتیں سُن کر گورنر نے اسی وقت چیف منسٹر کو بلایا۔ اور پھر طے ہوا کہ ریاست کے تمام ایم ایل اے اپنے اپنے حلقہ میں جائیں اور مسلمانوں کو ڈھارس دلائیں کہ تم لوگ بے ڈر ہو کر رہو۔ تمہارے خلاف کوئی اشر پسند کچھ بھی کرنے نہیں پائے گا۔ اس کے بعد حالات معتدل ہو گئے۔ یہاں تک کہ خود بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت ٹوٹ گئی۔ نئے الکشن میں راجہ ویربھدر اسنگھ چیف منسٹر ہو گئے۔ حال ہی میں ان کی حکومت نے ریاست میں ایک سو اردو ٹیچر بھرتی کرنے کا اعلان کیا ہے۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی نے بتایا کہ شملہ میں وشومیدھ یگیہ بڑے پیمانہ پر ۲۲ - ۲۵ مئی ۱۹۹۴ کو ہوا۔ انھوں نے اس کے انعقاد میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اس موقع کو

استعمال کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ انھوں نے ایک جگہ لے کر وہاں اسلامی کتابوں کا اسٹال لگایا۔ ہندی اور انگریزی کتابیں دہلی سے لاکر یہاں رکھی گئیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہندو بہت کثرت سے ہمارے اسٹال پر آئے۔ انھوں نے دیکھا۔ باتیں کیں اور بہت سے ہندوؤں نے کتابیں خریدیں۔ آنے والوں میں سے ایک ہندو نے حسب ذیل تاثرات ہندی زبان میں لکھے :

اسلام کو اپنی آتما سے تو جانا تھا، سمجھا تھا۔ پرنتو اس کا اتہاس یا کھیہ کتاب قرآن نہیں پڑھا تھا۔ آپ کی یہ پردرشنی بہت اچھی لگی۔ تھا اس سے بہت اپیوگی کتابیں ملیں۔ ایسی پردرشنی ہر جگہ، ہر شہر میں کبھی کبھی ایسے موقعوں پر لگتی رہنا چاہئے تاکہ ایک دوسرے کے دھرم کو اچھی طرح سمجھا جا سکے۔

گیان چند شرما، بال وکاس پریوجنا ادھیکاری، گھماری، بلاسپور۔

مولانا ممتاز صاحب ۱۹۶۳ سے شملہ میں مقیم ہیں۔ وشومیدھ یگیہ (۲۲۔ ۲۶ مئی ۱۹۹۴) کے بارہ میں انھوں نے بتایا کہ وہ بہت کامیاب رہا۔ دوسری ہندی کتابوں کے علاوہ ۵۵ عدد ہندی ترجمۂ قرآن لوگوں نے حاصل کئے۔

بک اسٹال پر یگیہ کے ایک بڑے مہاتما آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو تو آپ کا یہ اسلامی بُک اسٹال بہت اچھا لگا۔ اب بتائیے کہ آپ کو ہمارا یگیہ کیسا لگا۔ مولانا ممتاز صاحب نے کہا کہ ہم کو آپ کے یگیہ میں بہت بڑی کمی محسوس ہوئی۔ انھوں نے تعجب کے ساتھ پوچھا کہ وہ کیا ___ مولانا ممتاز صاحب نے کہا : جیسے ہم نے یہاں ہندی زبان میں اسلامی لٹریچر لاکر رکھا ہے اسی طرح آپ کو بھی اردو میں ہندوازم پر لٹریچر یہاں رکھنا چاہئے تھا۔ سوامی جی اس جواب سے بہت متاثر ہوئے۔ اور کہا کہ آپ نے جو کہا سچ کہا۔

بالوگنج کی مسجد میں تین نمازیں پڑھیں ___ مغرب، عشاء اور فجر۔ یہاں شام کو دیر تک نشست ہوئی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے۔ یہ سلسلہ کئی گھنٹہ تک چلتا رہا۔

فجر کی نماز میں امام صاحب نے سورہ البروج پڑھی۔ اس میں یہ آیت تھی ... واللہُ مِنْ وَرَائِهِم مُحِيط۔ فجر کے بعد میں نے اسی کو درس کا موضوع بنایا۔ میں نے کہا کہ اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں۔ اللہ ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان ہے۔ وہ دشمنان اسلام کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس میں ہمارے لئے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ یہ آیت

اہل ایمان کے لئے حوصلہ کی آیت ہے۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں میں نے کہاکہ موجودہ زمانہ میں مسلم دانشوروں اور رہنماؤں نے دعوت کے لئے کوئی مثبت کام تو نہیں کیا۔ البتہ انھوں نے دعوت کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔

ہندستان میں ایسی قومی پالیسی اختیار کی گئی جس کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گہری نفرتیں پیدا ہوگئیں۔ یورپ میں مختلف واقعات کے نتیجہ میں غیر مسلموں کے اندر شدید غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں۔

میں نے کہاکہ یہ میڈیا کا زمانہ ہے۔ اس لئے مسلم رہنماؤں اور دانشوروں کو اپنی کارروائیوں میں سخت احتیاط کرنی چاہئے۔ مثال کے طور پر، سلمان رشدی کے معاملہ میں تمام لوگوں نے جو موقف اختیار کیا اس کا مثبت نتیجہ تو کچھ نہیں نکلا۔ البتہ میڈیا کی رپورٹنگ کے نتیجہ میں وہ ساری دنیا میں اسلام کی بدنامی کا سبب بن گیا۔ اب مسلمان میڈیا کی شکایت کر رہے ہیں، حالاں کہ اس قسم کی شکایت غلطی پر مزید سادہ لوحی کا اضافہ ہے۔

ایک صاحب سے آر ایس ایس کے مسئلہ پر بات ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں آر ایس ایس کو مسلمانوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں سمجھتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آر ایس ایس اپنی عمر پوری کرکے اب ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ باعتبار ڈھانچہ زندہ ہے نہ کہ باعتبار تحریک۔

آر ایس ایس ۱۹۲۵ میں قائم ہوئی۔ اس وقت انڈیا زراعتی دور میں تھا۔ لوگوں کے پاس کافی وقت تھا۔ وہ صبح سویرے بڑی تعداد میں شاکھاؤں میں شریک ہوتے تھے۔ مگر اب انڈیا صنعتی دور میں پہنچ چکا ہے۔ اب لوگوں کے پاس اس قسم کی لگزری کے لئے وقت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ آر ایس ایس کو قریب سے دیکھیں تو آپ پائیں گے کہ اس میں زیادہ بوڑھے لوگ ہیں۔ نوجوان طبقہ اب آر ایس ایس کی طرف رخ نہیں کر رہا ہے۔ آر ایس ایس کے رہنماؤں کی قدیم کتابوں میں خواہ جو الفاظ بھی لکھے ہوئے ہوں۔ مگر آر ایس ایس اب ایک ختم شدہ طاقت (spent force) ہے۔ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت کھو چکی ہے کہ وہ کسی کے لئے خطرہ بن سکے۔

شملہ کی مال روڈ یہاں کی بہت خاص سڑک سمجھی جاتی ہے۔ مولانا ممتاز صاحب اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ میں مال روڈ سے گزر رہا تھا۔ اس سڑک پر ایک جگہ بلندی پر لالہ لاجپت رائے کا

اسٹیچو لگا ہوا ہے۔ اس اسٹیچو میں ان کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ ان کا بایاں ہاتھ کمر سے اٹکا ہوا ہے۔ اور دایاں ہاتھ اس طرح اٹھا رکھا ہے کہ ہاتھ کی ایک انگلی (شہادت کی انگلی) اوپر آسمان کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

مولانا ممتاز صاحب نے بتایا کہ ایک بار میں اپنے ایک ہندو واقف کار کے ساتھ اس سڑک سے گزر رہا تھا۔ ہم لوگ اس اسٹیچو کے سامنے پہنچے تو ہندو ساتھی نے کہا: ایک انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر لالہ جی کیا کہہ رہے ہیں۔ مولانا ممتاز صاحب نے جواب دیا: وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ ایک ہے۔ ہندو ساتھی نے یہ سنا تو ہنس کر بولا کہ یہاں بھی تم نے اپنے دھرم کی تبلیغ شروع کر دی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر اگر دعوتی ذہن ہو تو کس طرح وہ ہر موقع پر اپنی بات کہنے کے مواقع پا سکتا ہے۔

یہاں ایک مسلم خاتون (عائشہ) نے مخصوص حالات میں ایک ہندو ڈاکٹر کیدار ناتھ سے شادی کر لی۔ چند سال پہلے ہندو ڈاکٹر کا انتقال ہو گیا۔ اپریل ۱۹۹۴ میں تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں مذکورہ مسلم خاتون کا انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت خاتون نے وصیت کی کہ مجھ کو جلایا نہ جائے بلکہ مسلم طریقہ پر مجھ کو قبرستان میں دفن کیا جائے۔ خاتون کے داماد نے ایسا ہی کیا۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی نے خاتون کے ہندو داماد سے کہا کہ "آپ سوچئے کہ وہ عورت جس نے اپنی پوری زندگی آپ لوگوں کے ساتھ ہندو فیملی میں گزاری، پھر وہ کون سی طاقت تھی جو موت کے وقت اس سے یہ کہلوا رہی تھی کہ مجھ کو دفنایا جائے، مجھ کو جلایا نہ جائے۔"

یہ سن کر مذکورہ ہندو گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے مولانا ممتاز صاحب سے کہا کہ مجھ کو اسلامی لٹریچر دیجئے۔ میں اس کا مطالعہ کروں گا تاکہ اسلام کے بارہ میں واقفیت حاصل کروں۔

۷ جولائی کی صبح کو ہم لوگ شملہ کی جامع مسجد دیکھنے کے لئے نکلے۔ مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ساڑھے نو بجے ہم لوگ ایک گلی میں پہنچے جہاں ایک دروازہ پر "جامع مسجد" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو بہت سے کشمیری مزدور بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے لئے مسجد گویا مفت جائے قیام ہے۔ مسجد کے ذمہ دار بھی اس کو گوارا کئے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح مسجد آباد رہتی ہے۔

اگر کشمیری مزدور یہاں نہ ہوں تو مسجد میں سناٹا نظر آئے۔

جامع مسجد کے امام مولانا محمد عالم ندوی ہیں۔ مولانا ندوی الرسالہ پڑھتے ہیں۔ ان سے دیر تک الرسالہ مشن کے بارہ میں بات ہوئی۔ انھیں کچھ شکوک تھے۔ خدا کے فضل سے گفتگو کے بعد ان کے شکوک رفع ہو گئے۔

جامع مسجد کے دروازہ پر گھڑی کی ایک دکان نظر آئی۔ یہ محمد لیسین کشمیری کی دکان تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔ مگر غالباً حالات کی بنا پر ابھی تک اس کا فیصلہ نہ کر سکے۔

چنڈی گڑھ کے انگریزی اخبار ٹریبون (The Tribune) کے شمارہ ۷ جولائی میں ایک مضمون تھا اس کا عنوان تھا:

Privitisation is no panacea

اس میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا میں اس وقت پبلک سکٹر کے ۲۴۶ یونٹ ہیں۔ ان میں حکومت نے ۱۵۰ ہزار (150,000) کروڑ روپیہ لگایا ہے۔ مضمون میں پبلک سکٹر کی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

> If the public sector failed in India, it was because of the command system imposed on it by politicians and the bureaucracy in their frantic search for power.

انٹلکچول کس طرح لوگوں کی سوچ کو بگاڑتا ہے اس کی یہ ایک مثال ہے۔ یہ مضمون پبلک سکٹر کو باقی رکھنے کی حمایت میں لکھا گیا ہے۔

روزگار میں لگی ہوئی خواتین کی سب سے بڑی تعداد پبلک سکٹر میں ہے۔ اس طرح کے اور بھی بعض طبقات ہیں جن کا مفاد پبلک سکٹر کو باقی رکھنے میں ہے۔ اس لئے پبلک سکٹر کی حمایت میں برابر مضامین چھپوائے جارہے ہیں۔ مذکورہ اقتباس میں ذہن کو خراب کیا گیا ہے۔ پبلک سکٹر کی ناکامی کا سبب اقتصادی عمل سے محرک (incentive) کو ختم کر دینا ہے۔ مگر غیر متعلق طور پر اس کا ایک اور سبب نکال کر اس پر مضمون لکھا جارہا ہے۔

۷ جولائی کی دوپہر کو شملہ سے واپسی ہوئی۔ شملہ سے کالکا تک کا سفر بذریعہ کار طے کرنا تھا۔ میں اور ڈاکٹر چاری ایک گاڑی میں روانہ ہوئے۔ راستہ میں کچھ دیر کے لئے ہوٹل پائیں وڈ

(Hotel Pinewood) میں ٹھہرے۔ یہ ایک خوبصورت ہوٹل ہے جو پہاڑی کے دامن میں بنایا گیا ہے۔

راستہ میں ڈاکٹر چاری نے کئی سبق آموز باتیں بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے جبلپور میں انگریز کلکٹر ہوا کرتا تھا۔ ایک بار شیعہ لوگوں نے آکر کلکٹر سے کہا کہ جس راستہ سے ہمارا تعزیہ گزرنے والا ہے وہاں ایک درخت کی شاخ سڑک کے اوپر آگئی ہے۔ ہم تعزیہ کی اونچائی کم نہیں کرسکتے۔ انگریز کلکٹر نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ ہم اس کو کٹوا دیتے ہیں۔ کلکٹر کے آدمیوں نے دیکھ کر کلکٹر صاحب سے کہا کہ یہ درخت تو پیپل کا درخت ہے۔ اس کی شاخ کاٹی جائے گی تو ہندو لوگ بگڑ جائیں گے۔ اب کلکٹر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ آخر میں ایک تحصیلدار نے کہا کہ میری سمجھ میں ایک تدبیر آتی ہے۔ میں اس کو استعمال کرتا ہوں۔

تحصیل دار نے ایک ہاتھی والے کو پکڑا اور اس سے کہا کہ تم اس مسئلہ کو حل کرو۔ ہاتھی والے نے اپنا ہاتھی اس سڑک پر چلایا۔ ہاتھی درختوں کی پتیاں اور شاخیں توڑتا ہوا مذکورہ پیپل تک پہنچا۔ یہاں ہاتھی والے نے اپنے ہاتھی کو کچھ دیر روکا۔ ہاتھی نے اپنی سونڈ اِدھر اُدھر گھمائی۔ آخر کار اس نے مذکورہ شاخ توڑ کر گرا دی۔ ہاتھی چوں کہ ہندوؤں کی نظر میں گنیش دیوتا کا روپ مانا جاتا ہے۔ اس لئے وہ ہاتھی کے عمل پر غصہ نہیں ہوسکتے تھے۔ چنانچہ شاخ راستہ سے ہٹ گئی۔ اور تعزیہ آسانی کے ساتھ اس سے گزر گیا۔ یہ سطریں واپسی میں ہوٹل پائن وڈ کے کمرہ نمبر ۱۰۳ میں بیٹھ کر لکھی گئیں۔

مسٹر چاری (سابق کلکٹر) نے کہا کہ مدھیہ پردیش میں ان کے چیف سکریٹری مسٹر ادتار تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ضلع کلکٹر کے پاس کسی معاملہ سے نپٹنے کے لئے اتنے زیادہ ذرائع ہوتے ہیں کہ فورس کا استعمال اس کے لئے ناکامی کے ہم معنی ہے:

Use of force means his failure.

میں اضافہ کروں گا کہ ہر آدمی کے پاس خدا کے دئے ہوئے اتنے زیادہ ذرائع ہیں کہ اس کے لئے طاقت کا استعمال اس کی ناکامی کا ثبوت ہے۔ آدمی کی عقل بے حساب طاقتوں کا خزانہ ہے۔ یہ کلکٹر کی پولیس فورس سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ معاملہ پیش آنے کی صورت میں آدمی اگر حواس باختہ

نہ ہو، اور وہ اپنی عقل کو صحیح طور پر استعمال کرے تو وہ ہر چیز پر قابو پا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی آدمی اپنی عقل کو کام میں لانے کے بجائے اپنے ہاتھ میں پتھر اٹھاتا ہے یا اپنے ہاتھ میں گن سنبھالتا ہے تو یہ اس کی ہار کی بات ہے نہ کہ جیت کی بات۔

شملہ سے کالکا تک کا سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا، میں کار سک (car sick) ہوں چنانچہ مجھ کو دوبارہ چکر آنے لگا۔ اس کے بعد میں نے مسٹر چاری کو آگے کی سیٹ پر بیٹھا دیا اور پیچھے کی سیٹ پر لیٹ گیا۔ لیٹنے کی وجہ سے بقیہ راستہ میں کافی سکون رہا۔

کالکا سے دوبارہ ہمالین کوئن کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ میری طبیعت چوں کہ ٹھیک نہیں تھی، اس لئے منتظمین نے ایک کیبن تنہا مجھ کو دیدیا۔ یہاں بھی دوبارہ لیٹے لیٹے سارا راستہ طے ہوا۔ ۷ جولائی ۱۹۹۴ کی رات کو گیارہ بجے، ہم لوگ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

میں دہلی سے شملہ گیا، اور شملہ سے دوبارہ واپس آیا۔ اوپر کی سطریں اسی سفر کی مختصر روداد ہیں۔ یہ ایک جسمانی سفر تھا۔ اس طرح ہر آدمی ذہنی سفر کرتا رہتا ہے۔ بعض اوقات ذہنی سفر کی اہمیت جسمانی سفر سے زیادہ ہوتی ہے۔ مگر شاید ذہنی سفر کی روداد کو انسانی زبان میں قلم بند کرنا ممکن نہیں۔ ذہنی سفر کی روداد کو الفاظ کی صورت دینے کے لئے ہمیں اگلے مرحلۂ حیات کا انتظار کرنا چاہئے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصّہ لینا ہے جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18

अल-रिसाला (الرسالہ ہندی)

الرسالہ فورم بھوپال کی جانب سے جلد الرسالہ ہندی کی اشاعت شروع ہوگئی ہے۔ پہلا شمارہ "یکساں سول کوڈ" نمبر ہے۔ جو حضرات الرسالہ ہندی جاری کروانا چاہیں وہ مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں :

The Manager, Al-Risala (Hindi)
C/o Cosmos Commercial Agency, Iqtadar Manzil,
Moti Masjid Square Kamla Park Road Bhopal-462001 M.P. Tel. 530928

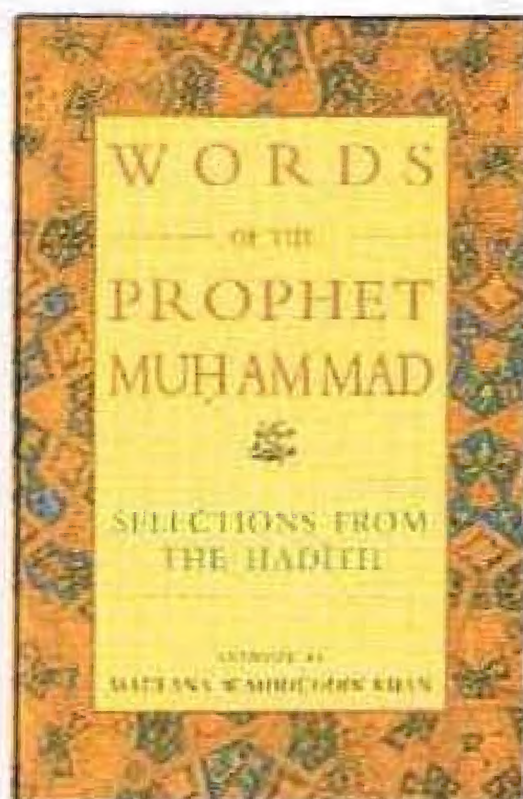
معاون مدیر کی ضرورت

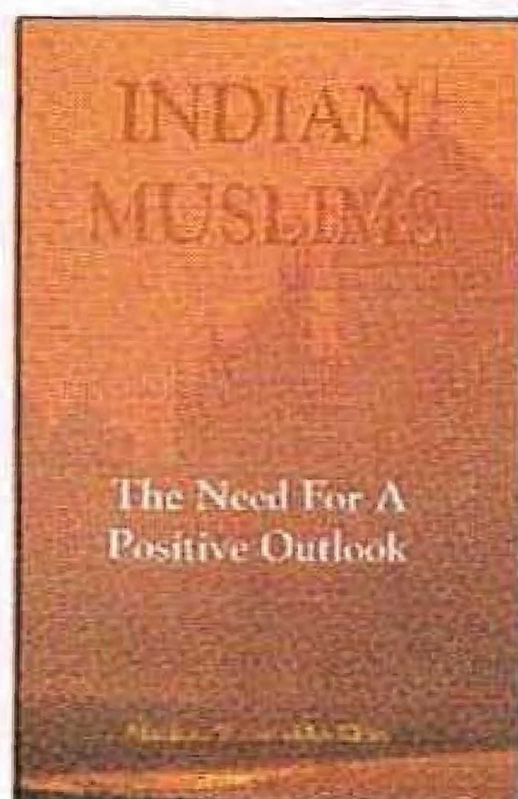
الرسالہ اردو کے لیے ایک معاون مدیر کی ضرورت ہے۔ امیدوار کو اردو زبان پر اچھی دسترس ہونا چاہیے۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر عربی اور انگریزی کی بھی بقدرِ ضرورت صلاحیت موجود ہو۔ امیدوار کے اندر محنت اور لگن کی صفت ہونا ضروری ہے۔ امیدوار حضرات ضروری تفصیل کے ساتھ اپنی درخواستیں روانہ فرمائیں۔

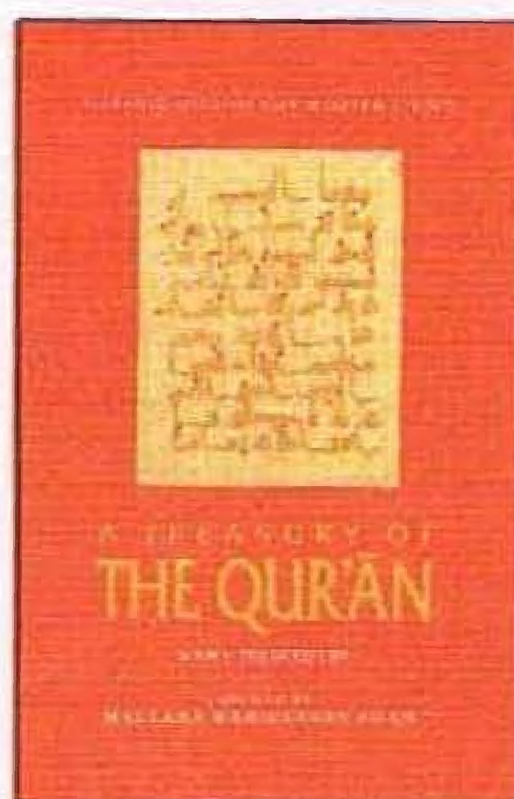
AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013 Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333

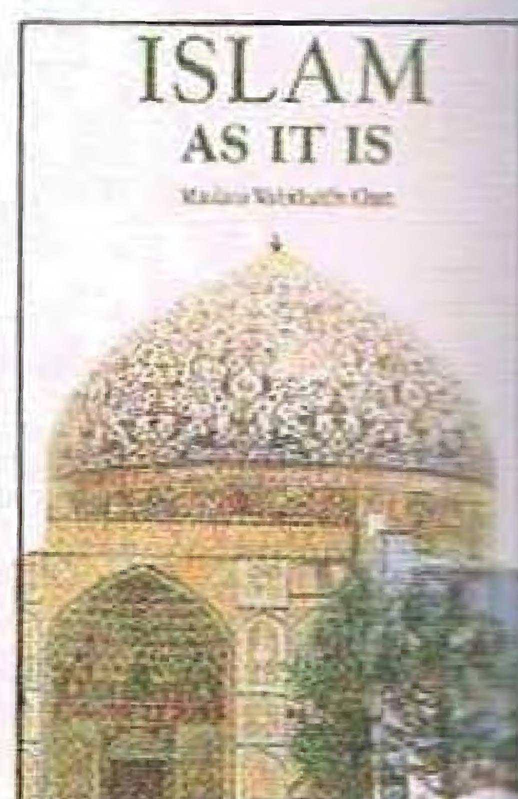
خصوصی اعلان

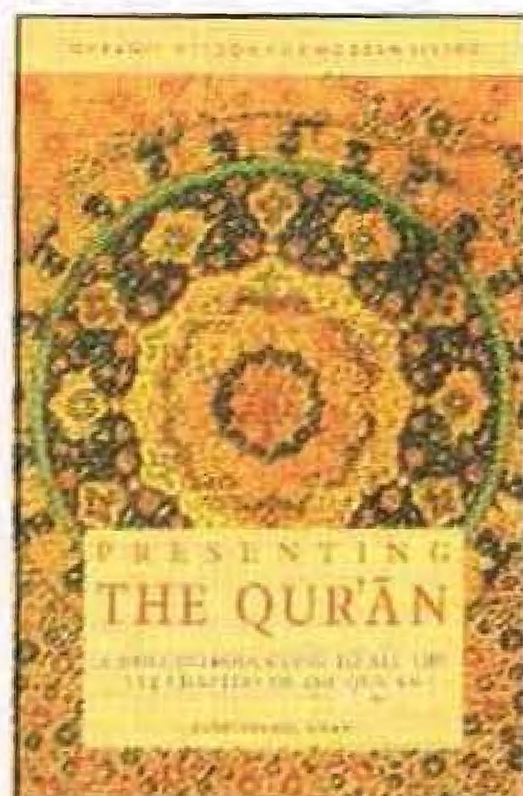
دفتر میں ماہنامہ الرسالہ کے پرانے متفرق شمارے (اردو اور انگلش دونوں زبانوں میں) بڑی تعداد میں جمع ہوگئے ہیں، جس کو افادۂ عام کی غرض سے نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے ہوگی۔ جبکہ ۱۰۰ یا اس سے زائد شمارے منگوانے کی صورت میں مزید ایک روپے کی تخفیف کردی جائے گی۔ یعنی ۱۰۰ روپے میں ۱۰۰ شمارے۔ نیز ڈاک خرچ بھی مکتبہ کے ذمہ ہوگا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بطورِ خود اور مقامی اصحابِ خیر کو ترغیب دے کر اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ تاکہ الرسالہ کے دعوتی اور تعمیری مشن سے وہ لوگ بھی آشنا ہوجائیں جو اب تک کسی وجہ سے آشنا نہ ہو سکے۔ (مینجر ماہنامہ الرسالہ)

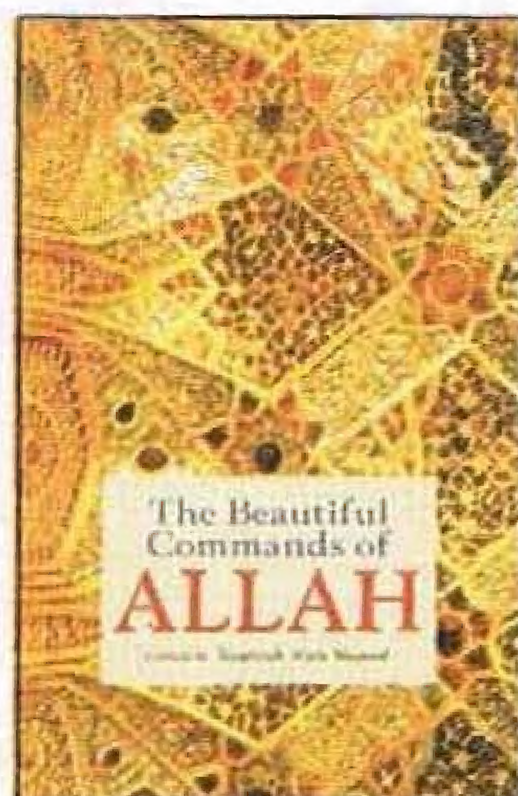


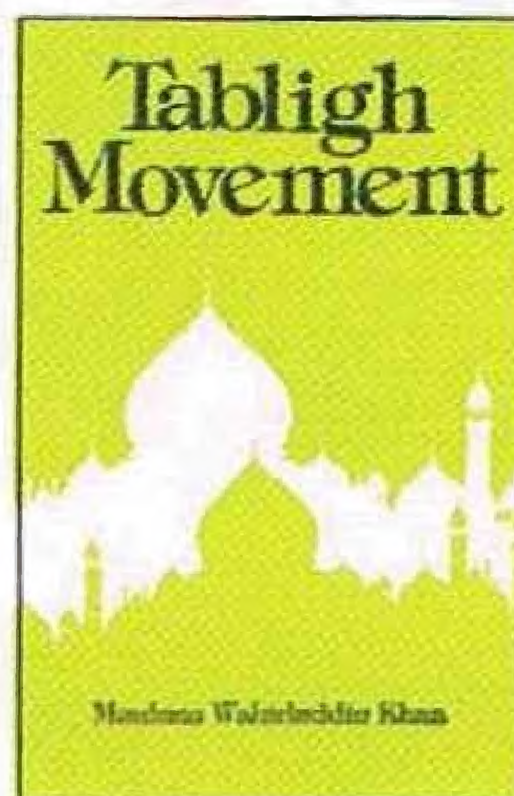


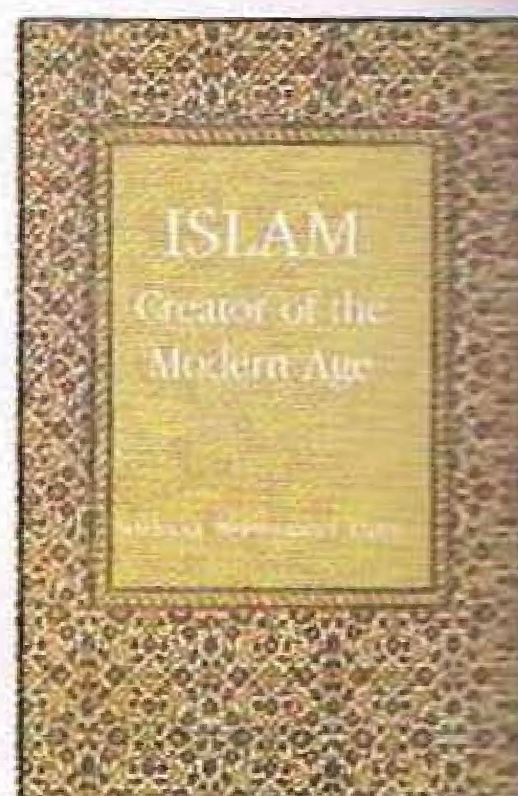


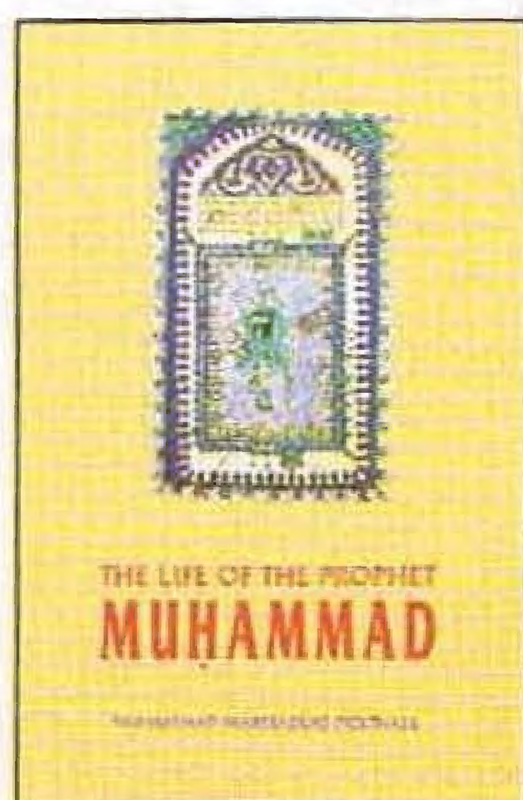


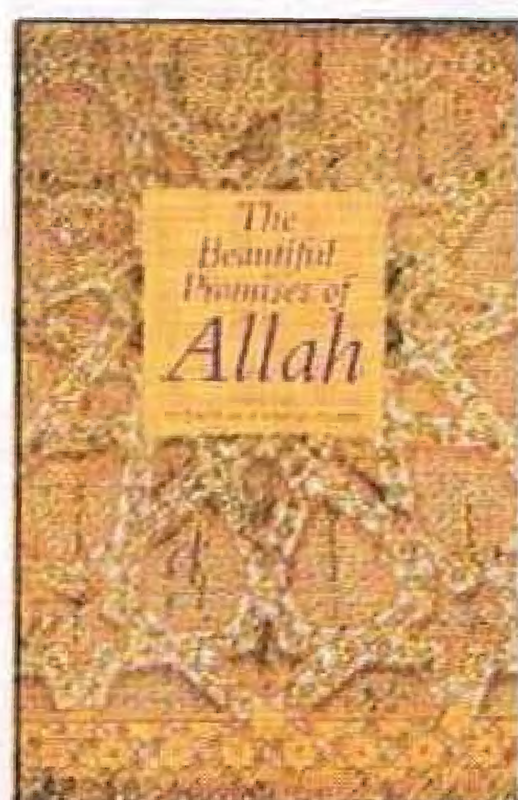


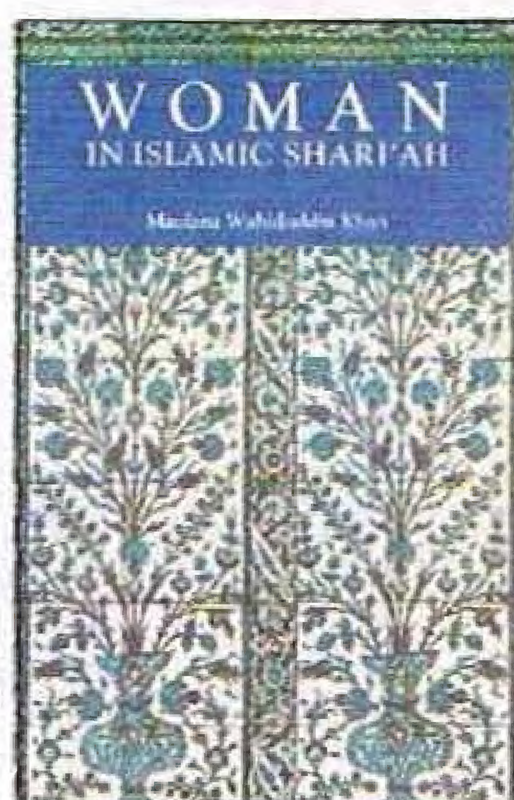


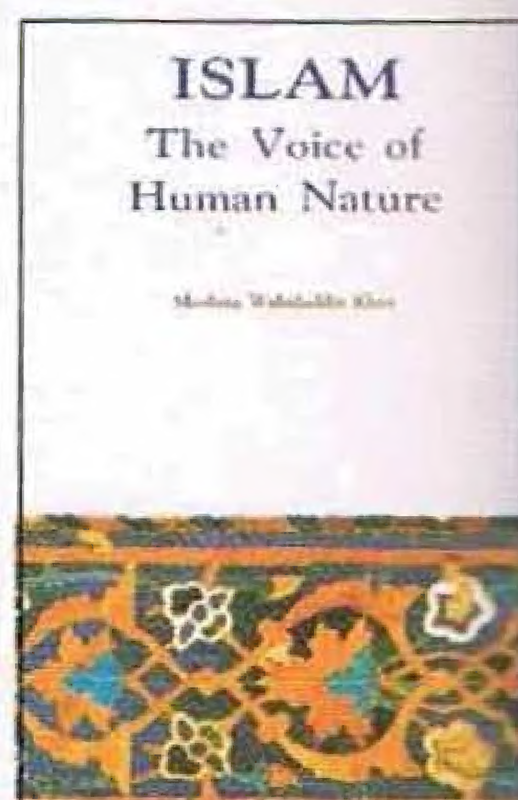


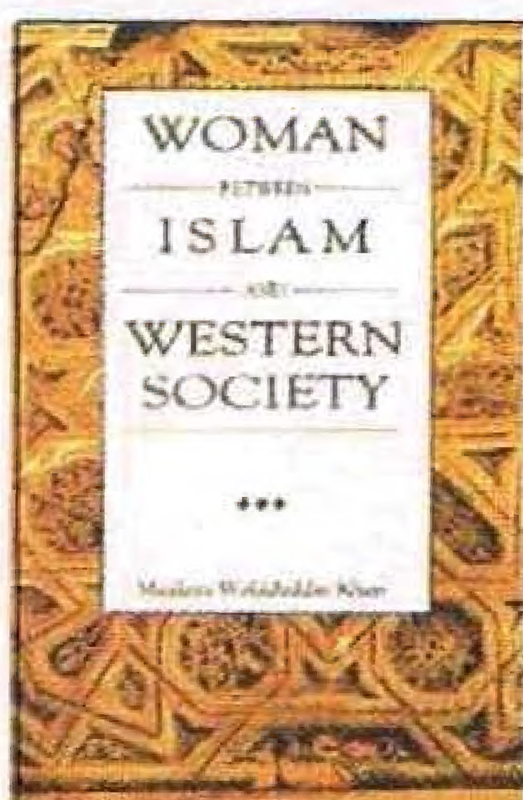


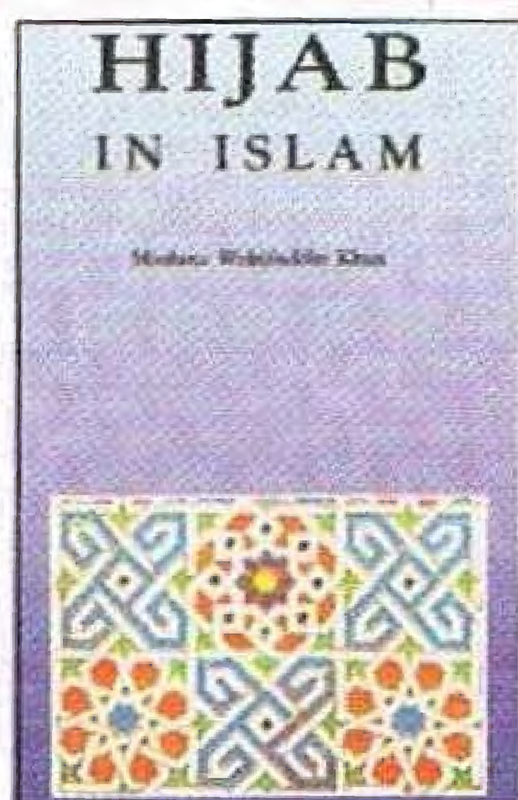


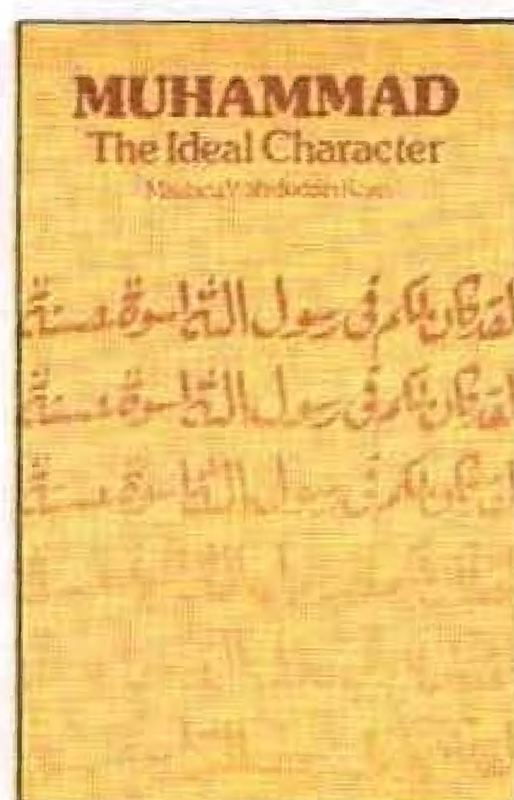


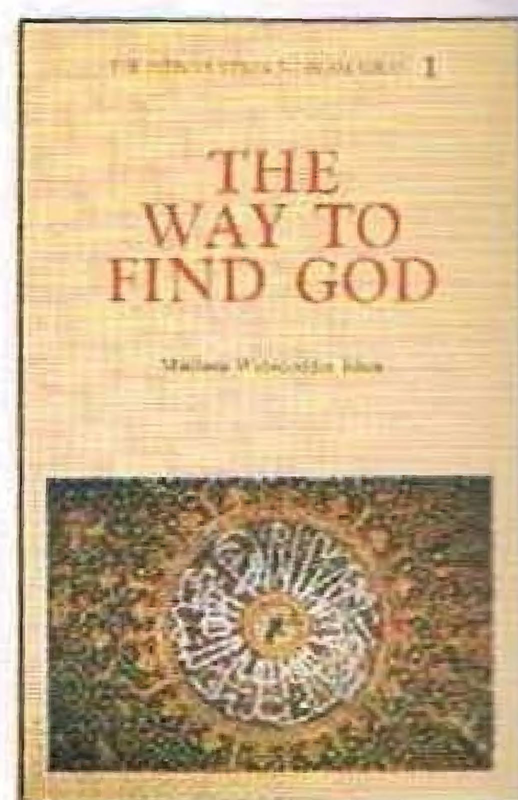












AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013

RNI 28822/76 • U(SE) 12/97
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/97